نظامِ زکوٰۃ

اور جدید

معاشی مسائل

محمد یوسف گورایہ

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد

سلسلۂ مطبوعات ادارہ نمبر (۲۵)

اشاعت اول : جون ۱۹۷۲ء

تعداد : پانچ سو

قیمت : پانچ روپیہ پچاس پیسہ

ناشر

ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

فہرست مضامین

پیش لفظ

''نظام زکواۃ اور جدید معاشی مسائل،، یوسف گورایہ صاحب کا ایک بصیرت افروز مقالہ ہے جسے کتابی شکل میں تعلیم یافتہ حضرات کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔ یوسف گورایہ صاحب ادارۂ تحقیقات اسلامی کے ممتاز رکن ہیں اور ان کے کئی ایک مضامین ادارہ تحقیقات اسلامی کے انگریزی سہ ماہی رسالہ ''اسلامک اسٹڈیز،، اور اردو ماہنامہ ''فکرونظر،، میں چھپ چکے ہیں۔ جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ظاہر ہوگا یوسف گورایہ صاحب اس ملک کے ایک ابھرتے ہوئے مفکر ہیں اور اگر انہوں نے محنت و مشقت اور جانفشانی سے کام کیا تو بہت جلد علمی دنیا میں ان کو ایک نمایاں مقام حاصل ہو جائے گا۔

زیر نظر کتاب کی دو خصوصیات ہیں جنہوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اولاً اس میں معاشی مسائل کا بے لاگ تجزیہ کیا گیا ہے اور ملکی معیشت میں کسانوں کا طبقہ جو اہم کردار ادا کرتا ہے اس کی بڑی اچھی توضیح کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسانوں کا مسئلہ اور ان کی معاشی بدحالی ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور جب تک اس کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی اور اس مسئلہ کو حل کرکے کسانوں کو جاگیرداروں اور زمین داروں کی غلامی سے آزاد نہیں کیا جائے گا اس وقت تک پاکستان کی معیشت کبھی اصلاح پذیر نہیں ہو سکے گی۔ زمین‌داری اور جاگیرداری کے تحت کسانوں کی اس

وقت وہی حیثیت ہے جو غلاموں کی زمانہ قبل از اسلام میں تھی اور جس طرح اسلام نے اپنے معاشی پروگرام میں غلامی کے انسداد کی طرف اولین توجہ دی اسی طرح اب اس امر کی ضرورت ہے کہ کسانوں کو زمینداروں اور جاگیرداروں کی غلامی سے آزاد کرایا جائے۔ اس کے بغیر اسلامی مساوات کا ادعا ایک ادعائے باطل رہے گا۔

دوسری خصوصیت جس نے مجھے متاثر کیا وہ یہ ہے کہ اس کتاب میں بعض قرآنی آیات کی تفسیر ایک نئے اور جدید انداز میں کی گئی ہے جس سے ہمیں اس دور کے جدید معاشی مسائل کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اب تک قرآن کریم کی تفسیر کا جو طریقہ رائج رہا ہے اس سے ہمارے جدید مسائل پر کوئی روشنی نہیں پڑتی بلکہ صرف زمانہ صدر اسلام کے حالات پر روشنی پڑتی ہے جو اب موجود نہیں ہیں۔ اس طرح قرآن کی افادیت ضائع ہو جاتی ہے کیونکہ ہم اپنے جدید مسائل میں اس سے رہنمائی حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر قرآن کی افادیت کو قائم رکھنا ہے تو ہمیں اس کی تفسیر ایسے انداز میں کرنی چاہئے جس سے ہمارے دور کے معاشرتی اور معاشی مسائل پر روشنی پڑے۔ بات یہ ہے کہ زمانہ اور حالات کی تبدیلی سے خیر و شر کی صورتیں اور شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً ایک نفاق کو لیجئے، نزول قرآن کے زمانہ میں بھی نفاق موجود تھا اور اس زمانہ میں بھی موجود ہے۔ لیکن اس کی شکل وہیئت بدل گئی ہے۔ اس زمانہ کا نفاق یہ ہے کہ لوگ جمہوریت کا نام لیتے ہیں اور خود کو جمہوریت پسند کہتے ہیں مگر کام ایسے کرتے ہیں جو غیر جمہوری ہوتے ہیں یا جن سے جمہور کا نقصان ہوتا ہے، یہ بھی نفاق کی ایک جدید صورت ہے۔ اب اگر قرآن میں جہاں جہاں نفاق کا ذکر کیا گیا ہے ان مقامات کی تفسیر میں نفاق کی اس موجودہ شکل یا اور دوسری جدید شکلوں کا ذکر

نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہمارے دور کے لئے قرآن کی عملی افادیت بیکار ہو جائے گی۔ اسی طرح ظلم ایک برائی تھی جو نزول قرآن کے زمانہ میں بھی تھی اور اس زمانہ میں بھی ہے۔ لیکن ظلم کی اشکال بدل گئی ہیں۔ پہلے آقا غلام پر ظلم کرتا تھا اب جاگیردار اور زمیندار کسانوں پر ظلم توڑتے ہیں، پہلے بادشاہ ادنیٰ سی سیاسی مخالفت پر لوگوں کو قتل کر دیتا تھا اب حکومتیں اپنے سیاسی مخالفین کو بغیر مقدمہ چلائے جیلوں میں بند کر دیتی ہیں۔ اب قرآن میں جہاں جہاں ظلم کا ذکر ہوا ہے اس کی تفسیر میں اگر ظلم کی صرف انہیں اشکال کا ذکر کیا جائے جو صدر اسلام میں موجود تھیں تو اس سے ہمارے موجودہ معاشرہ کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کی تفسیر کرتے وقت ظلم کی موجودہ شکلوں کو بھی سامنے لایا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک قرآنی احکامات و تعلیمات کا انطباق موجودہ مسائل پر نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ہم قرآن سے کوئی عملی رہنمائی حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔

نظام زکواۃ جس پر یوسف گورایہ صاحب نے یہ کتاب لکھی ہے اسلام کا ایک اہم ترین فریضہ اور رکن ہے۔ لیکن مدت مدید سے یہ نظام معطل ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد سے غالباً اس پر کبھی عمل نہیں کیا گیا۔ اس طرح مسلمانوں نے زکواۃ کو عملاً دین سے خارج کر دیا۔ یہی حشر نظام شورائیت کا بھی ہوا، قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے شورائیت پر اصرار کیا تھا اگرچہ اس بارے میں کوئی تفصیلی نظام وضع نہیں کیا تھا بلکہ مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ زمانہ اور حالات کے لحاظ سے شوریٰ کی تفصیلات معین کریں۔ خلافت راشدہ کے عہد تک شوریٰ کا نظام قائم رہا لیکن اموی اور عباسی حکمرانوں نے رسول اللہ اور خلفائے راشدین کی سنت کو درخور

اعتنا نہیں سمجھا بلکہ اس کی جگہ قیصر و کسریٰ کی سنت کو زندہ کیا اور جابرانہ ملوکیت قائم کر دی ۔ مسلمانوں نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ ملوکیت کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا ۔ یہ ''تعاون علی الاثم و العدوان'' صدیوں تک جاری رہا یہاں تک کہ مسلمانوں میں سے جمہوریت اور شورائیت کی روح بالکل فنا ہو گئی اور وہ ہر جابر حکمران کی اطاعت کے عادی ہو گئے ۔ اس طرح اسلام کا ایک اور ستون مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں سے گرادیا ۔ یہی حال غلامی کے انسداد کا بھی ہوا ۔ اسلام نے غلاموں کی حالت میں جو اصلاح کی تھی اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ حالات سازگار ہوتے ہی نظام غلامی کو بالکل ختم کردیا جائے ۔ مگر مسلمانوں نے انسداد غلامی کی طرف عملاً کوئی قدم نہیں بڑھایا اور یہ سعادت یورپ والوں کو نصیب ہوئی کہ انہوں نے اسلام کے پروگرام انسداد غلامی پر عمل کر دکھایا ۔ ایک اور کمزور طبقہ جس کے حقوق اسلام نے بحال کئے تھے عورتوں کا تھا ۔ یہ مساوات انسانی کی طرف اسلام کا ایک اہم قدم تھا ۔ لیکن جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا مسلمانوں نے عورتوں سے ان کے حقوق چھین لئے ۔ اور انہیں پردہ کی چہار دیواری میں بند کر کے عملاً بے حق بنا دیا ۔ اب اگر عورتوں کو کچھ حقوق حاصل بھی ہیں، تو وہ جہالت ، ناخواندگی اور معاشرہ کی رسوم و قیود کے باعث اپنے حقوق سے استفادہ نہیں کر سکتی ہیں ۔ غرض کہ اسلام نے مساوات انسانی کا جو پروگرام پیش کیا تھا مسلمانوں نے اس کو عملاً قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔ جبکہ بعض غیر مسلم قوموں نے اس پر عمل کر دکھایا اور یہی ان کے عروج کا باعث ہوا ، اسلامی تعلیمات میں سے مسلمانوں نے صرف عبادات اور فقہی قوانین کو اپنایا، باقی کو اسلام سے عملاً خارج کردیا ۔ آج بھی جب اسلامی حکومت کا نام لیا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ قرون وسطیٰ کے جامد فقہی نظام کو

عملاً نافذ کر دیا جائے اور بس - باقی رہا اسلام کے پروگرام کے دوسرے اہم اجزاء مثلاً نظام زکواۃ کا نفاذ ، غلامی کا انسداد (یعنی مزدوروں اور کسانوں کو سرمایہ‌داروں اور جاگیرداروں کے ظلم سے آزاد کرانا) ، عورتوں اور مردوں میں مساوات کا قیام ، جمہوری اور شورائی نظام کا نفاذ، ان تمام امور سے مسلمانوں کو کوئی دلی وابستگی نہیں ہے - اب اگر غور کیا جائے کہ اس امر کا کیا سبب ہے کہ مسلمان پورے اسلام کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں بلکہ صرف عبادات اور فقہی قوانین کو اسلام کا ماحصل سمجھتے ہیں تو معلوم ہو گا کہ یہ اموی اور عباسی دور کا ورثہ ہے - ان جابر حکمرانوں نے اپنے مفاد کی خاطر اسلام کی صورت بگاڑ دی تھی اور اس کی تعلیمات کے صرف وہی اجزاء قبول کئے تھے جس سے ان کے مفاد پر ضرب نہیں پڑتی تھی - یہ مسخ شدہ اسلام صدیوں تک نافذ رہا - اس طرح اہل حکومت ، اہل ثروت اور اہل مذہب کا وہ باہمی تعاون جس کی طرف یوسف گورایہ صاحب نے اپنی کتاب میں اشارہ کیا ہے نہ صرف دور جاہلیت میں بلکہ مسلمانوں کی تاریخ میں بھی جاری رہا -

اب اگر مسلمانوں کو نکبت و ادبار کے دور سے نکل کر عروج و ترقی کی منزلیں طے کرنا ہے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اموی اور عباسی دور کے مسخ شدہ اسلام کو خیر باد کہیں اور رسول اللہ اور خلافت راشدہ کے دور کے اصلی اور حقیقی اسلام کی طرف لوٹ جائیں- دوسرے الفاظ میں انہیں زمانہ جدید کے مصالح کے پیش نظر نظام شورائیت اور جمہوریت کو اس کی مناسب شکل میں اپنانا ہوگا- نظام زکواۃ کو پھر سے نافذ کرنا ہو گا یعنی یتامیٰ مساکین ، معذوروں ، بیواؤں اور بے روزگاروں کی کفالت کا انتظام کرنا ہوگا- غلامی کی موجودہ صورت کو ختم کرنا ہو گا جس میں چند سرمایہ‌دار اور جاگیردار

مزدوروں اور کسانوں کی ایک کثیر تعداد کو غلامی کے پھندے میں پھنسائے ہوئے ہیں۔ عورتوں کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر انہیں ان کے وہ تمام حقوق واپس کرنے ہوں گے جو انہیں اسلام نے عطا کئے تھے۔ اس پروگرام پر عمل کئے بغیر مسلمانوں کی نجات ناممکن ہے۔

محمد مظہر الدین صدیقی ریڈر
ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

۲ جون ۱۹۷۲ء

زکواۃ کی ادائیگی اور وصولی کا مسئلہ

اسلام نے روحانی ومادی اقدار '' عبادات و معاملات '' کو لازم و ملزوم قرار دے کر تاریخ مذاہب عالم میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا ہے۔ اسلام کی نظر میں وہ شخص جو '' معاملات انسانی '' کی حسن ادائیگی میں ایک خاص مقام رکھتا ہو، لیکن '' عبادات الہی'' کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہو، ویسا ہی ہے جیسے ایک شخص عبادات کی حسن ادائیگی کے باوجود '' معاملات '' میں قاصر ہو، قرآن مجید میں نماز کو حسن معاملات کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ ان الصلواۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر (۲۹ : ۴۵)۔ درحقیقت نماز ان تمام کاموں سے روک دیتی ہے، جن سے معاملات انسانی میں فساد بپا ہوتا ہے اور جو فطرت انسانی کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف جس نمازی سے معاملات انسانی میں کوتاہی ہو، قرآن حکیم کے فیصلے کے مطابق ایسے نمازی کو اس کی نماز جہنم میں جانے سے نہیں روک سکتی ۔ قرآن نے معاملات انسانی کو پس پشت ڈالنے والے نمازیوں کو، نمازوں کی پابندی کے باوجود، جہنمی کہا ہے، اور سورۃ '' الماعون '' میں ایسے نمازی کو دین الہی کا جھٹلانے والا قرار دیا ہے، اور اس ''مکذب بالدین'' نمازی کے خلاف فرد جرم یہ عائد کی ہے کہ وہ یتیموں کو نفرت و حقارت سے دھکے دیتا اور محتاجوں اور مسکینوں سے ہمدردی نہیں کرتا ہے۔ چنانچہ ایسے نمازیوں کے بارے میں فرمایا ہے :۔ جہنم کا ایندھن ہیں وہ نمازی جو نمازوں کی ادائیگی کے باوجود معاملات انسانی کی ادائیگی سے بالکل بےخبر ہیں۔ وہ نمازوں کا محض ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں اور محض ریا اور

دکھاوے کی خاطر نمازی بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ عملی زندگی میں اپنے مال میں سے ایک حصہ مستقل طور پر یتیموں اور مسکینوں کی بھلائی کی خاطر خرچ کرنا تو درکنار، روز مرہ کی ضرورت کی اشیاء بحض عاریۃً دینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔

خلیفہ اول نے عبادات و معاملات میں تفریق کرنے پر اس طرح تنبیہ کی تھی: '' واللہ لاُقاتلن من فرق بین الصلوۃ و الزکواۃ ''، اللہ کی قسم جو لوگ صلواۃ و زکواۃ (حقوق اللہ اور حقوق العباد) میں فرق کرتے ہیں، میں ان کے خلاف جہاد کروں گا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رض نے عبادات و معاملات کے، اجر و ثواب اور اہمیت و مقام کے لحاظ سے، برابر ہونے کو نہایت حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ جزیہ والی زمین مسلمان کے لئے جائز نہیں، اس لئے کہ ایسا کرنے سے اس دور کے معاشی و اقتصادی نظام میں بحران کا خطرہ پیدا ہوسکتا تھا، اور اس اعتبار سے یہ معاملہ معاملات انسانی کو درہم برہم کرنے کا سبب بن سکتا تھا، چنانچہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے عبداللہ بن عمرو بن العاص رض کہتے ہیں :-

''کیا میں تمہیں ایسے شخص کے بارے میں اطلاع نہ دوں جس نے اسلام قبول کیا لیکن اس کے بعد الٹے پاؤں کفر کی طرف پلٹ گیا؟۔ یاد رکھو یہ وہ شخص ہے جو اسلام قبول کرنے کے بعد نہایت حسن و خوبی سے اسلام پر کاربند رہا، پھر اس نے اسلام کی خاطر ہجرت کی، اور ہجرت کے دشوار گذار مرحلہ سے بھی نہایت عمدگی سے گذر گیا۔ پھر جہاد کا وقت آیا تو اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خوب کار ہائے نمایاں انجام دیئے۔ لیکن یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد پھر اس نے جزیہ والی زمین کا بار اپنے اوپر ڈال لیا۔ یہی وہ

شخص ہے، جو الٹے پاؤں کفر کی طرف پلٹ گیا ۲ ''۔

اب غور کیجئے کہ اسلامی تعلیمات نے صحابہ کرامؓ میں عبادات و معاملات کے اندر توازن کا کتنا زبردست احساس پیدا کر دیا تھا۔ اور جہاں کہیں وہ معاملات انسانی میں عدم توازن دیکھتے، وہ زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کی پابندی کے باوجود جہنم کی وعید کا فتویٰ دیتے۔ اور ان کے نزدیک عبادات و معاملات میں افراط و تفریط کرنے والا شخص مجرم قرار پاتا۔

اسلام کی انہی جامع تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ مسجد نبوی، جس طرح صحابہ کرامؓ کے لئے نماز کی ادائیگی کے لئے اجتماع گاہ تھی، اسی طرح معاملات انسانی طے کرنے کے لئے جلسہ گاہ کا کام بھی دیتی تھی۔ صحابہ کرامؓ جس طرح '' حی علی الصلواۃ '' کی پکار پر عبادات الٰہی کی ادائیگی کے لئے مسجد نبوی کا رخ کرتے تھے، اسی طرح '' الصلواۃ جامعۃ '' کی آواز پر وہ انتظامی امور اور باہمی معاملات، مشاورت و مباحثہ کے ذریعہ طے کرنے کے لئے مسجد نبوی میں جمع ہوتے تھے۔ حضرات صحابہ کی نظر میں معاملات انسانی کا عدل و انصاف کے ساتھ طے کرنے کے لئے جمع ہونا اور عبادات الٰہی پر باقاعدگی اور پابندیٔ وقت کے ساتھ مواظبت کرنا دونوں اجر و ثواب میں برابر تھے۔ صحابہ کرام کا یہ کردار دراصل قرآن حکیم کی تعلیمات کا آئینہ دار تھا۔ یہودیوں نے دین کو محض قانون بنا دیا تھا، جس کی وجہ سے وہ قرآنی فیصلے کے مطابق غضب الٰہی کے مستحق ٹھہرے۔ اور عیسائیوں نے دین کو محض عبادات کا مجموعہ قرار دے لیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ گمراہ قرار پائے (غیر المغضوب علیھم والضالین)۔ اسلام نے اس افراط و تفریط میں متوازن اور محتاط صراط مستقیم یہ نکالی کہ عبادات و معاملات دونوں کو برابر قرار دے دیا۔ ان میں سے تنہا کسی ایک کی پابندی کرنا یہودیت یا عیسائیت کا احیا کرنا ہے، جو اسلام کی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔ اسلام میں جامعیت ہے۔ لہٰذا اجر و ثواب

یا نجات و کامیابی کا دار و مدار دونوں پہلوؤں میں توازن پر ہے۔ جن افراد یا اقوام میں ان دونوں کا زیادہ سے زیادہ توازن ہوگا وہی دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران ہوں گی۔

اسلامی تعلیمات کی یہ جامعیت صدیاں گزرنے کے بعد افراط و تفریط کا شکار ہو گئی۔ اور اب بدقسمتی سے اسلام محض چند رسمی عبادات کی ادائیگی کا نام رہ گیا ہے۔ اسلام کے ساتھ اس بے وفائی اور بدعہدی کا نتیجہ یہ ہے کہ خود مسلمان یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ اسلام میں اقتصادی و معاشی زندگی کے لئے کوئی رہنما اصول موجود نہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اسلام کے ''معاملاتی'' پہلو کا بالتفصیل جائزہ لیا جائے۔ اس کی جامعیت اور ہمہ گیریت پر کثرت سے لکھا جائے تاکہ اسلام ایک عالمگیر، متحرک اور قابل عمل دین کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آسکے۔ اور روحانیت و مادیت کے موجودہ بحران میں اہل عالم کی پوری پوری رہنمائی کر سکے۔

ہم اپنے نقطۂ نظر کی توضیح و تشریح کے لئے اس بحث کو صرف اسلام کے مالی و معاشی نظام تک محدود رکھیں گے اور بیشتر مثالیں معاملات کے اسی پہلو سے پیش کریں گے۔

ابتدائے اسلام میں اسلام کا مالیاتی نظام، عام طور سے دو مدوں پر مشتمل تھا، ایک زکواۃ اور دوسرے فۓ، بالعموم مسلمانوں سے وصول ہونے والے تمام مالی واجبات کا مجموعی نام زکواۃ تھا اور غیر مسلم رعایا کی طرف سے تمام مالی واجبات کا عمومی نام فۓ تھا۔ ذیل میں ہم اس مالیاتی نظام کا مختصر تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اسلامی تعلیمات میں، زمانے کے مسلسل تغیر پذیر حالات کا مقابلہ کرنے کی پوری پوری قوت موجود ہے۔

مملکت اسلامی کے بیت المال (State Treasury) کی مد اول، زکواۃ، قرآن حکیم کی اس آیت پر مبنی ہے:-

انما الصدقات للفقرآء والمساکین و العاملین علیها والمؤلفة قلوبهم و فی الرقاب و الغارمین و فی سبیل الله و ابن السبیل ط فریضة من الله ط و الله علیم حکیم (۹: ۶۰)

صدقات تو صرف حق ہے غریبوں کا اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان پر متعین ہیں۔ اور جن کی دلجوئی کرنا (منظور) ہے۔ اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں اور قرضداروں کے قرضہ میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں میں، فرض ہے اللہ کی طرف سے، اور اللہ بڑے علم والا اور بڑی حکمت والا ہے۔

آیت کریمہ میں لفظ زکواۃ کے بجائے صدقات استعمال ہوا ہے، لیکن چونکہ آیت کے آخر میں ان صدقات کو " فریضة من الله " اللہ کی طرف سے فریضہ، قرار دیا گیا ہے، اس لئے قرآن نے مسلمانوں سے جس مالی مطالبے کا بتکرار ذکر، زکواۃ کے نام سے کیا ہے، اسے ان صدقات کے مترادف قرار دے کر ان صدقات کو زکواۃ قرار دے لیا گیا ہے، آیت بالا میں زکواۃ کے مذکورہ مصارف پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بعثت رسول صلعم سے لے کر، اس آیت کے نزول تک مکی اور مدنی دور میں جن جن مدوں پر مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر مال خرچ کرنے کی ترغیب دی جاتی رہی، ان سب مدوں کو، دو ایک مدوں کے اضافے کے ساتھ، اس آیت میں یکجا بیان کر دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کے اس بیان سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس آیت کے نزول سے قبل قرآن کریم مسلمانوں کو جس انفاق کی ترغیب دیتا تھا، اب اس کی ادائیگی تطوع (رضا کارانہ) نہیں رہی تھی، بلکہ ایک فریضہ کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس فریضہ کی ادائیگی کی حیثیت اب انفرادی کے بجائے اجتماعی ہوگئی تھی۔ یعنی جس طرح یہ مالی فریضہ ادا کئے بغیر چارہ نہیں، اسی طرح اس فریضہ کی ادائیگی، ادا نہ ہونے کے برابر ہے، جب تک کہ مسلمانوں کی حکومت کی موجودگی میں زکواۃ حکومت کو ادا نہ کی جائے۔

نظام زکواۃ کے یہ دونوں اہم ترین پہلو اسلام کے تدریجی اور ارتقائی مزاج

کا منطقی نتیجہ تھے ۔ جس طرح زکواۃ کے علاوہ اسلام کے باقی فرائض بتدریج عہد رسالت کے حالات کے مطابق اپنی تکمیل کو پہنچے اور اس تکمیلی صورت نے ، پہلے کی تدریجی منازل و مراحل کو تطوع (رضاکارانہ) کی حیثیت دے کر ، خود اصول کی شکل اختیار کرلی ۔ اور نتیجہ ً خدا اور رسول صلعم کی طرف سے ان فرائض کی ادائیگی کا صاف اور سیدھا مطالبہ ان فرائض کو ان کی آخری اصولی شکل میں ادائیگی تھا ، اسی طرح نظام زکواۃ بھی اپنی تدریجی منازل طے کرنے کے بعد جب اصولی شکل اختیار کر گیا ، تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے اس حق '' آتوا الزکواۃ '' کا مطلب صاف اور واضح الفاظ میں یہی تھا کہ زکواۃ حکومت کو ادا کی جائے زکواۃ کی اس اصولی حیثیت نے اپنے قبل کے مالی مطالبات کو رضاکارانہ طور پر خرچ کرنے کے لئے باقی رہنے دیا ۔

قرآن حکیم کی تعلیمات پر مبنی اس نظام زکواۃ کا یہ پہلو ہمیشہ سے متفق علیہ رہا ہے کہ زکواۃ اللہ کی طرف سے ایک فریضہ ہے ، جسے ہر صاحب نصاب مسلمان کو اپنے مال سے ادا کرنا ہے ۔ لیکن اس کا یہ پہلو مختلف فیہ ہو گیا ہے کہ زکواۃ کی ادائیگی حکومت کی بجائے افراد یا جماعتوں کو ادا کرنے سے ہو جاتی ہے ، اس سلسلہ میں نظام زکواۃ پر دو کڑی آزمائشیں آئیں ۔ چونکہ یہ دونوں آزمائشیں تاریخی اعتبار سے '' خیرالقرون '' میں پیش آئیں ، اس لئے نظام زکواۃ کے اس پہلو پر ان آزمائشوں کے جو نتائج و اثرات مترتب ہوئے وہ '' خیرالقرون '' کے بعد آنے والے مسلمانوں کے لئے زکواۃ کے اس پہلو کو سمجھنے میں انتہائی فیصلہ کن ثابت ہوں گے ۔ نظام زکواۃ کے اس پہلو پر پہلی آزمائش تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی وفات کے بعد اس وقت پیش آئی جب بعض مسلمان عرب قبائل نے باقی ارکان دین —— نماز ، روزہ ، حج وغیرہ —— تو ویسے ہی ادا کرتے رہنے کا یقین دلایا ، لیکن زکواۃ حکومت کو ادا کرنے کے بجائے اپنے

طور پر جمع اور خرچ کرنے کی تجویز پیش کی، در اصل یہ اللہ و رسول ص کی تعلیمات پر مبنی نظام زکواۃ میں ایک ترمیم تھی۔

تاریخ اسلام پر نظر رکھنے والے پوری طرح آگاہ ہیں کہ داخلی و خارجی طور پر جو خطرات اس وقت اسلام کو درپیش تھے، ان کے پیش نظر حکومت مدینہ کے لئے یہ کتنا نازک سرحلہ تھا، خود حضرت عمرؓ جیسی جلیل القدر ہستی بھی خلیفۂ وقت حضرت ابوبکرصدیقؓ کو یہ مشورہ دینے پر مجبور ہوئی کہ ہنگامی حالات کے سدھرنے تک زکواۃ کی ادائیگی کو جماعتی یا قبائلی سطح تک تسلیم کر لیا جائے، لیکن خلیفۂ رسول ص، جناب صدیق اکبرؓ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس نازک وقت پر بھی نظام زکواۃ کے اصولی حیثیت اختیار کرلینے کے بعد، اسے دوبارہ افراد کے ہاتھوں میں دینے پر رضامند نہ ہوئے، اور پوری استقامت اور جرأت ایمانی کے ساتھ اعلان فرمایا: ۔

> ”اگر ان لوگوں نے اس نظام زکواۃ میں رتی بھر رد و بدل کرنے کی کوشش کی، اور جو کچھ یہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ادا کرتے تھے، اس میں سے مجھے اونٹ کے پاؤں میں باندھی جانے والی ایک رسی بھی دینے سے انکار کیا تو میں ان کے خلاف بحیثیت سر براہ مملکت اسلامی جہاد کروں گا ۳“۔

الغرض خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نظام زکواۃ میں رونما ہونے والے سب سے پہلے فتنے کا پوری جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا اور دلائل و براہین سے نظام زکواۃ کے اس پہلو کی وضاحت میں بتایا کہ مسلمانوں کی حکومت کی موجودگی میں کسی فرد یا جماعت یا ادارے یا مدرسے کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ حکومت اسلامی کے اس اہم ترین رکن کا خود انفرادی یا جماعتی

یا قبائلی طور پر انتظام کرے۔ خلیفہؓ اول کی اسلام فہمی ، جرأت ایمانی اور استقامت نے دوسرے صحابہ کو بھی ان کے نقطہ نظر کا قائل کر دیا ، اور پھر تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اس بات پر اتفاق ہوگیا کہ جو فرد یا قبیلہ یا جماعت حکومت کی موجودگی میں افراد یا جماعتوں یا اداروں کو زکواۃ دے۔ یا افراد یا جماعتیں یا ادارے حکومت کی اجازت کے بغیر خود عامۃ المسلمین سے زکواۃ وصول کریں ، تو ایسی صورت میں زکواۃ وصول کرنے والے اور زکواۃ ادا کرنے والے سب حکومت کے باغی قرار پائیں گے ، اور مسلمان حکومت کا فرض ہوگا کہ ایسے افراد کو حکومت کا باغی قرار دے کر ان کے خلاف جہاد کا اعلان کرے۔ ان کے خلاف یہ جہاد اس وقت تک جاری رہے گا ، جب تک یہ لوگ زکواۃ حکومت کو دینے کا اعلان نہ کر دیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ، کی سرکردگی میں تمام صحابہ کرامؓ نے اس متفقہ فیصلہ پر عمل کیا اور حکومت کو زکواۃ ادا نہ کرنے والوں کو باغی قرار دے کر ان کے خلاف جہاد کا اعلان کیا ۔ اور یہ جہاد اپنی اہمیت اور اجر و ثواب میں کفر و شرک کے خلاف جہاد کرنے سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ حکومت مدینہ نے اپنے تمام وسائل ، حکومت کو زکواۃ ادا نہ کرنے والے باغیوں کے خلاف استعمال کئے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے ، جب تک کہ ان باغیوں کی کمر نہ ٹوٹ گئی اور انہیں خدا و رسول صلعم کی منشاء کے مطابق حکومت کو زکواۃ ادا کرنے پر مجبور نہ کر دیا ۔ اس جہاد میں باغیوں کی ہر قوت کا مقابلہ کیا گیا اور ان کی باغیانہ سرگرمیاں ختم کر دی گئیں۔ باغیوں نے ایک دلیل یہ پیش کی کہ اللہ کا حکم ہے : خذ من اموالھم صدقۃ (۹:۱۰۳) جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم صرف آنحضرت صلعم کی زندگی تک محدود تھا ۔ اور آپؐ کی وفات کے بعد یہ حکم عملاً منسوخ ہوگیا ۔ صحابہ کرامؓ نے اس دلیل کو رد کرتے ہوئے بتایا کہ باغیوں کا نقطہ نظر غلط ہے ۔ اور

قرآن کی اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آنحضرت صلعم کی وفات پر یہ حکم منسوخ ہوگیا ، بلکہ ''خذ'' میں جس حکم کی تاکید کی گئی ہے ، اس سے مراد مسلمانوں کی حکومت کا سر براہ ہے - اور جو بھی مسلمانوں کی حکومت کا سر براہ ہوگا ، یہ حکم الٰہی اس کے لئے ہوگا ، اور اس حکومت کے تابع تمام مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ مسلمان حکومت کو رسول اللہ صلعم کا نائب سمجھ کر زکواۃ اسے ادا کریں [۳] -

نہ صرف یہ کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم متفقہ طور پر اس فیصلے پر پہنچے بلکہ خود سرور کائنات ؐ نے بھی خذ من اموالھم صدقۃ (۹:۱۰۳) کی یہ تفسیر فرمائی تھی - صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حضور ؐ نے اس کی شرح یوں فرمائی : تؤخذ من اغنیائھم فترد علی فقراءھم ہ (زکواۃ مسلمانوں کے مالدار طبقوں سے لے کر ان کے پست حال طبقوں میں پلٹا دی جائے گی) - اس حکم کی ہمہ گیریت و جامعیت کو صرف رسول اللہ صلعم یا صرف عہد رسالت پر منحصر خیال کرنا اور بعد کے سربراہان مملکت اسلامیہ کو اس سے خارج قرار دینا کم نظری وکج فہمی ہوگی -

شارح صحیح بخاری حافظ ابن حجر العسقلانی نے اس حدیث کی شرح میں جو کچھ لکھا ہے ، اس مضمون کی مزید وضاحت کے لئے فیصلہ کن ہے - وہ لکھتے ہیں :- استدل به علی ان الامام ھو الذی یتولی قبض الزکاۃ و صرفھا اما بنفسه و اما بنائبه فمن امتنع منھم اخذت منه قھراً [۶] - یعنی اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ سربراہ مملکت ہی بذات خود یا اپنے جانشین کے ذریعہ زکواۃ کی وصولی اورخرچ کا انتظام کرے گا ، اور جو ان کو ادا کرنے سے باز رہے گا ان سے جبراً زکواۃ لی جائیگی -

الغرض زکواۃ کی وصولی اور اس کے خرچ کا انتظام سر براہ مملکت کا کام ہے ، وہی اس کا نگران و ذمہ دار ہوگا - سربراہ مملکت اپنا یہ حق یا تو بذات

خود استعمال کرے گا یا اپنے نائبین کے ذریعے اس کا انتظام کرائے گا ۔ اور اگر مسلمانوں کی حکومت کی موجودگی میں کوئی شخص یا طبقہ حکومت وقت کا یہ حق ادا کرنے سے گریز کرے یا اپنے طور پر استعمال کرے اور حکومت کو زکواۃ ادا کرنے کے راستے میں آڑے آئے تو ایسی صورت میں حکومت کو پورا اختیار ہوگا کہ وہ ایسے افراد ، اداروں یا انجمنوں کا پوری طاقت و قوت کے ساتھ مقابلہ کرے اور ان کا زور توڑ کر بالجبر زکواۃ وصول کرے ـــــ ایک دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں : من منع منا الزکواۃ فانا ناخذھا منہ ، (جو کوئی ہم (حکومت) سے زکواۃ روکے گا یا حکومت کی زکواۃ کی وصولی میں مزاحم ہوگا ہم اس سے (بالجبر) وصول کرکے رہیں گے ۔)

'' خیر القرون '' میں ، جو اسلامی تاریخ کا بہترین دور ہے نظام زکواۃ پر دوسری بڑی آزمائش کی گھڑی اس وقت آئی ، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، خلیفہ ثالث کی شہادت کے بعد مسلمان حضرت علی رض اور حضرت معاویہ رض کی حمایت میں دو گروہوں میں بٹ گئے ۔ اس سیاسی عدم استحکام اور داخلی خلفشار کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا کہ زکواۃ کس کو ادا کی جائے ۔ یہ مسئلہ اہل حجاز کے لئے خاص طور پر پیچیدہ تھا ۔ کیونکہ وہ اس سیاسی کش مکش میں کسی حد تک غیر جانب دار تھے ، چنانچہ اہل مدینہ ، خصوصاً انصار نے اس دور کی سب سے بڑی علمی شخصیت حضرت عبد اللہ بن عمر رض سے ، اس بارے میں استفسار کیا ۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رض نے جو مسئلے کی نزاکت و اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے ، بڑی سوچ بچار اور ذمہ داری کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ سیاسی حالات خواہ کچھ ہوں اور مسلمانوں کی حکومت خواہ کیسے ہی ہاتھوں میں کیوں نہ ہو ، زکواۃ بہر حال حکومت کو ادا کی جائے گی ، اور کتاب اللہ ، سنت رسول اللہ ﷺ اور عمل خلفاء ثلاثہ کی تعلیمات کا آخری اور اٹل

اصول یہی ھے کہ مسلمانوں کی حکومت کی موجودگی میں زکواۃ کا وہ حکم اور اللہ تعالیٰ کا وہ مالی مطالبہ جو زکواۃ کے نام پر کیا گیا ھے۔ صرف اسی صورت میں ادا ھوسکتا ھے، جب کہ اسے حکومت کو ادا کیا جائے۔

چنانچہ اس وقت کے تمام جلیل القدر صحابہ کرام کا حضرت عبداللہ بن عمر رض کے اس فیصلے پر اجماع ھوگیا۔ اور غیر جانب دار صحابہ نے، جن میں حضرات سعد بن ابی و قاص رض، ابوھریرہ رض، ابو سعید خدری وغیرھم رضوان اللہ علیھم اجمعین شامل ھیں، نظام زکواۃ کو انتشار سے بچانے، اسے اللہ و رسول صلعم کی مرضی و منشا کے مطابق ادا کرنے اور نظام زکواۃ پر اس دوسری بڑی آزمائش میں اسے حکومت کا حق ثابت کرنے کے لئے اس وقت وھی کردار ادا کیا، جو پہلی آزمائش کے وقت خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، نے ادا کیا تھا۔ زکواۃ کی وصولی محض حکومت کا حق ثابت کرنے اور اس سے انحراف کے خلاف ان حضرات صحابہ کرام رض نے باقاعدہ ایک مہم چلائی۔ اس کے لئے زبردست دلائل فراھم کئے۔ اور یہ ثابت کیا کہ زکواۃ کی ادائیگی صرف اسی وقت ھو سکتی ھے جب کہ اسے حکومت وصول کرے۔ حکومت کے علاوہ کسی اور کے زکواۃ وصول کرنے سے نہ تو زکواۃ ادا ھوتی ھے اور نہ ھی وصول کرنے والا حکومت کا وفادار رھتا ھے۔ گویا حکومت اسلامی کو چھوڑ کر کسی اور کو زکواۃ ادا کرنے والا اور اسے وصول کرنے والا دونوں مسلمانوں کی حکومت کے باغی قرار پاتے ھیں اور حکومت کا فرض ھے کہ ایسے باغیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کرے۔ صحابہ کرام رض نے جرأت اور استقامت سے اس دوسرے فتنے کا مقابلہ کیا، اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کرلی گئی کہ سیاسی حالات خواہ کچھ ھوں، زکواۃ کی وصولی بلا شرکت غیرے صرف حکومت کا حق ھے۔

صحابہ کرام رض کے اس متفقہ فیصلے کے بعد اھل حجاز کو عملی دشواری

اب یہ پیش آرہی تھی کہ حجاز پر کبھی تو حامیان معاویہ رض کا غلبہ ہو جاتا اور کبھی حامیان علی رض کا، اور ایسی صورت میں زکواۃ کس حکومت کو ادا کی جائے؟ اب یہ صورت حال اتنی مشکل اور پیچیدہ تھی کہ اس سے نبٹنا آسان نہ تھا، اس لئے کہ دونوں حکومتیں ایک دوسرے کی نظر میں باغی تھیں۔ حامیان علی رض سمجھتے تھے کہ حامیان معاویہ رض باغی ہیں، اس لئے کہ انہوں نے خلیفہ راشد کے خلاف بغاوت کر رکھی ہے۔ اور حامیان معاویہ رض سمجھتے تھے کہ حامیان علی رض باغی ہیں کیونکہ انہوں نے خلیفہ راشد کو حرم مدینہ میں شہید کرکے حکومت پر قبضہ کرلیا ہے۔ اب ایسی حکومتوں میں سے کسی ایک کو زکواۃ ادا کرنے کا مسئلہ بہت پیچیدہ تھا۔ مزید برآں زکواۃ اهل شام کو دی جاتی یا اهل عراق کو، اهل حجاز کو اپنی ادا شدہ زکواۃ کے عوض حجاز کے رفاہ عامہ کے کام اور وهاں کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے انتظامات پر اس زکواۃ کے خرچ ہونے کا بہت کم امکان نظر آتا تھا۔ کیونکہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خاطر قدرتی طور پر اپنے جانب دار مراکز کا خاص خیال رکھنے پر مجبور تھیں، ان تمام مشکلات اور علاقائی مفادات کے باوجود اهل حجاز اس بات پر رضامند نہ ہوئے کہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ص اور عمل خلفاء ثلاثہ کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رض کا صاف اور سیدھا جواب یہ تھا کہ ”جو غالب آجائے، اسے زکواۃ دے دو[۸]“۔

جب یہی صورت حال کسی دوسرے موقع پر حضرات سعد بن ابی وقاص رض، ابوھریرہ رض، ابو سعید خدری رض اور عبد اللہ بن عمر رضوان اللہ علیھم اجمعین کے سامنے پیش کی گئی اور ایک سوال کی صورت میں اس طرح پوچھا گیا: ”یہ حکمران تو وہ کچھ کر رہے ہیں، جو تم دیکھ رہے ہو، کیا اس پر بھی ہم اپنی زکواۃ انہی کو دیں؟“ اسلام کے ان جلیل القدر ماہرین اصول صحابہ

کا متفقہ فیصلہ یہی تھا: ''زکواۃ انہی کو دو'' صحابہ کرام رض کے اس فیصلے کے بعد اکثر لوگوں کے ذہنوں میں حکمرانوں کی نیت اور اعمال پر اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے یہ سوال بار بار پیدا ہوتا تھا کہ حکمران زکواۃ کو صحیح طور پر استعمال میں نہ لائیں گے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رض نے اس سوال کے جواب میں مختلف مواقع پر جس اصرار اور استقامت کے ساتھ زکواۃ کی وصولی کو حکومت کا حق قرار دیا اور اس کی اجتماعی اہمیت کی بار بار وضاحت کی وہ نظام زکواۃ کی تاریخ میں نہایت اہم مقام رکھتی ہے۔ ایک دفعہ ربیع بن سعد کے اس سوال کے جواب میں کہ فتنہ کے زمانے میں اپنے زیر نگرانی یتیموں کے مال کی زکواۃ اپنے ضرورت مند چچا زاد بھائیوں کو دے دوں؟ تو آپ رض نے فرمایا: ''زکواۃ صرف حکومت کا حق ہے۔ اسے اہل حکومت کے حوالے کر دو۹'' اس سوال کے جواب میں کہ اہل حکومت زکواۃ کو صحیح جگہوں پر خرچ نہیں کرتے آپ رض نے فرمایا: خواہ کچھ بھی ہو، خواہ وہ ایسا ہی کریں، خواہ زکواۃ کے ذریعے وہ اپنے دسترخوان پر کتوں کا گوشت بانٹیں۔ اس سے کپڑے اور خوشبوئیں خریدیں۔ زکواۃ حکومت ہی کو ادا کرو۔ اور مزید فرمایا: زکواۃ ہر حالت میں حکومت کو ادا کی جائے گی، رہ گیا ان کے ذاتی اعمال کا مسئلہ تو جو نیکی کرے گا، وہ اپنے بھلے کے لئے، اور جو گناہ کرے گا، وہ اپنے برے کے لئے۔

چنانچہ حضرات سعد بن ابی وقاص، ابوہریرہ، ابو سعید خدری اور عبداللہ بن عمر رضوان اللہ علیہم اجمعین، نظام زکواۃ میں انتشار کے راستے میں ایک دیوار بن کر کھڑے ہوگئے اور اپنی استقامت، جرأت ایمانی اور پامردی سے فتنے کے اس دور میں نظام زکواۃ کو حکومت کی بجائے افراد، اداروں اور جماعتوں کے قبضے میں جانے سے بچا لیا، اور سیاسی عدم استحکام، اندرونی بدنظمی اور داخلی خلفشار کے اس نازک ترین دور میں اللہ اور رسول ص کے منشا

کے مطابق زکواۃ کو صرف حکومت کو ادا کرنے کے بارے میں پوری جرأت، حوصلہ مندی اور اسلام فہمی کا ثبوت دے کر ثابت کر دیا کہ زکواۃ کی وصولی صرف مسلمانوں کی حکومت کا حق ہے، جو اسے اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے، اور مسلمانوں کی حکومت کا یہ حق حکمرانوں کی ذاتی بےاعتدالیوں کی وجہ سے ساقط نہیں ہوسکتا۔

مندرجہ بالا بحث سے ذیل کے نتائج برآمد ہوئے:۔

۱ ۔ عہد رسالت میں زکواۃ کے تفصیلی مصارف والی سورۃ التوبہ کی آیت (۹:۶۰) کے نزول کے بعد انفاق فی سبیل اللہ، صدقات، خیرات وغیرہ، رضاکارانہ اور انفرادی ترغیبات پر مبنی نظام، اپنی تدریجی منازل طے کر کے ایک جامع اور مفصل نظام زکواۃ کی صورت میں اصولی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

۲ ۔ عہد رسالت میں نظام زکواۃ قائم ہوجانے کے بعد جب تک صاحب نصاب مسلمان زکواۃ کی ادائیگی کے وقت، حکومت کا یہ اصولی حق حکومت کو ادا نہ کر دے، اس وقت تک قرآن حکیم کا یہ مطالبہ مسلسل اس کے لئے باقی رہے گا، خواہ وہ اپنی دولت کا کتنا ہی بڑا حصہ رضاکارانہ رفاہی کاموں پر کیوں نہ خرچ کر ڈالے۔

۳ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی وفات کے بعد جب بعض مسلمان عرب قبائل نے زکواۃ کے علاوہ باقی ارکان دین اسی طرح ادا کرنے کا یقین دلا کر، جس طرح کہ وہ ارکان دین آنحضرت صلعم کے آخری دور میں ادا کرتے تھے، زکواۃ میں ترمیم کرنی چاہی اور زکواۃ کا نظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا، تو خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، کی سرکردگی میں مہاجرین و انصار نے متفقہ طور پر ایسے مسلمانوں کو

حکومت کا باغی قرار دیا ۔ اور ان کے خلاف جہاد اسی طرح فرض قرار دیا ، جس طرح دشمنان اسلام ، مشرکین عرب اور عراق و شام کے یہود و نصاریٰ کے خلاف ۔ اور جب تک زکواۃ ادا نہ کرنے والے باغیوں نے زکواۃ حکومت کو ادا کرنے کا دوبارہ عہد نہ کر لیا ، یہ جہاد مسلسل جاری رہا ۔

٤ ۔ خلفاء راشدین ، عشرہ مبشرہ اور دوسرے مہاجرین و انصار کے اس اجماعی فیصلے کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کی موجودگی میں زکواۃ حکومت کو ادا کئے بغیر اللہ کے حکم " وآتوا الزکواۃ " کی تعمیل ممکن نہیں : حکومت کی موجودگی میں جو افراد یا جماعتیں انفرادی طور پر زکواۃ جمع اور خرچ کریں گی ، وہ مسلمانوں کی حکومت کی باغی قرار پائیں گی ۔ خواہ ان افراد یا جماعتوں یا انجمنوں کی نیتیں کتنی ہی نیک اور ان کے ارادے کتنے ہی اچھے اور ان کے پروگرام کتنے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں ۔

٥ ۔ صحابہ کرام رض کا اس بات پر بھی اجماع ہے کہ حکمرانوں کی بےاعتدالیاں بھی زکواۃ حکومت کو ادا کرنے کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتیں ۔ صحابہ کرام کا اس بات پر بھی اجماع ہے کہ زکواۃ کا ہر حال میں حکومت کی موجودگی میں حکومت ہی کو ادا کرنا قرآنی حکم ہے ۔ یہ اپنی جگہ ایک بالکل علیحدہ اور مستقل بالذات حکم ہے ۔ اور حکمرانوں کی بےاعتدالی ایک دوسرا مسئلہ ہے ۔ اس لئے ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ۔

٦ ۔ نظام زکواۃ کے دو اہم پہلو —— مسلمانوں کی حکومت کی موجودگی میں زکواۃ کی ادائیگی صرف حکومت کو ادا کرنے سے ہی ہوگی ، اور

حکمرانوں کی بے اعتدالی زکواۃ کی ادائیگی میں حائل نہیں ہوگی —— ایسے هیں جن کا فیصلہ صحابہ کرام رض نے قرآن اور سنت رسول ص کی روشنی میں انتہائی قطعیت کے ساتھ کر دیا ، اور اس میں کسی ابہام کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اس بحث اور اس کے نتائج پر غور کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جیسے نماز اپنے تدریجی مراحل طے کرنے کے بعد جب آخری شکل میں جماعت کے ساتھ فرض ہوگئی تو کسی مسلمان کو نماز با جماعت کی موجودگی میں انفرادی طور پر فرض یا نفل نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں۔ اسے بہر حال جماعت کے ہوتے انفرادی نماز چھوڑ کر پہلے جماعت کے ساتھ فرض کی ادائیگی کرنا ہوگی ، کیونکہ فرض کے ترک کی صورت میں ہزارہا نوافل بھی فرض کا بدل نہیں ہو سکتے ، ایسے ہی مسلمانوں کی حکومت کی موجودگی میں زکواۃ کی ادائیگی صرف اسی صورت میں ہوگی کہ زکواۃ صرف حکومت کو ادا کی جائے ، اور زکواۃ حکومت کو ادا کرنے کی بجائے جو کچھ بھی اپنے طور پر کار خیر میں خرچ کیا جائے، وہ تطوعاً صدقہ و خیرات تو ہو سکتا ہے لیکن زکواۃ کے فریضے کا بدل ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ جس طرح مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ نماز کی امامت کے لئے اپنے میں سے بہترین آدمی کو امام بنائیں اور اگر امام بعض افراد کی پسند کا نہ ہو تو جب تک سب مل کر اسے باقاعدہ ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا امام مقرر نہ کر لیں، سب مسلمان اس امام کی امامت میں نماز ادا کریں گے ، اسی طرح زکواۃ حکومت کو ادا کرنا فرض ہے ۔ جس قسم کی بھی حکومت ہوگی ، زکواۃ اسے ادا کی جائے گی۔ اب اگر بعض افراد ارباب حکومت کو پسند نہیں کرتے تو جب تک وہ آئینی و جمہوری طرز پر یا انقلاب کے ذریعے حکومت کو بدل نہیں دیتے ، زکواۃ حکومت کو ادا کرتے رہیں گے۔

خلفاء راشدین کی سرکردگی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے

اس اجماع کا اثر یہ ہوا کہ عہد خلافت بنی امیہ اور عہد خلافت بنی عباس میں باوجود حکمرانوں کی بے اعتدالیوں کے زکواۃ ہمیشہ حکومت کو ادا کی جاتی رہی۔ اور صحابہ کرام رض کا یہ متفقہ فیصلہ صدیوں تک مسلمانان عالم کے لئے ایک الٰہی دستور کی حیثیت سے ہر اس سر زمین پر نافذ رہا جہاں کہیں بھی مسلمانوں کی ادنیٰ یا عظیم الشان سلطنتیں قائم رہیں۔ خراج و اموال کے موضوع پر امام ابویوسف رض کی کتاب الخراج یا اس کے بعد جتنی کتابیں تصنیف ہوئیں (جن میں ان آمدنیوں کی کیفیت اور تفاصیل موجود ہیں، جو مسلمانوں کی حکومت کے بیت المال میں جمع ہوتی تھیں) ان سب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زکواۃ کی آمدنی بیت المال کی آمدنیوں میں انتہائی اہم اور بہت بڑی آمدنی کی حیثیت سے مسلسل اور باقاعدہ جمع ہوتی رہی، وثوق کے ساتھ یہ کہنا کہ زکواۃ کب سے غیر اسلامی طریقہ پر انفرادی طور پر جمع و خرچ ہونے لگی، بے حد مشکل ہے۔ لیکن ایک محتاط اندازے کے مطابق زوال بغداد کے بعد جب وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا سیاسی شیرازہ منتشر ہوا، اور تاریخ اسلام میں سب سے پہلی دفعہ مسلمانوں پر چنگیز و ہلاکو وغیرہ کی ایک غیر مسلم حکومت مسلط ہوئی، تو اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے لئے ایک کافر حکمران کو زکواۃ نہ دینے کا جواز پیدا ہوا ہوگا۔ اس کے بعد نظام زکواۃ کا شیرازہ کچھ اس طرح منتشر ہوا کہ اب تک دوبارہ مجتمع نہ ہوسکا۔ صدیاں گزرنے کے بعد مملکت پاکستان، پھر سے اسلام کے نام پر معرض وجود میں آئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کے نام پر معرض وجود میں آنے والی حکومت نظام زکواۃ کو اس کا اصل مقام دلانے میں کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔

حواشی

۱ - امام بخاری صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۸۸، دهلی ۱۹۳۸ء

۲ - ابو عبید، کتاب الاموال، اردو، حصہ اول، ص ۲۱۱

۳ - ابو یوسف ، کتاب الخراج ، ص ۴۵ ، مطبوعہ بولاق ، ۱۳۰۲ھ
۴ - حافظ ابن حجر العسقلانی ، فتح الباری ، ج ۳ ، ص ۲۳۲ ، مطبع خیریہ ۱۳۱۹ھ
۵ - ایضاً
۶ - ایضاً ص ۲۳۱
۷ - ابو بکر محمد بن عمر الترمذی ، مختصر کتاب العالم و المتعلم ، ص ۵۱
۸ - ابو عبید ، ج ۲ ، ص ۳۴۹
۹ - ایضاً ج ۲ ، ص ۳۴۳

زکواۃ کے سلسلے میں حکومت کی ذمہ داریاں

اسلام جن خصوصیات کی وجہ سے دوسرے مذاھب پر فوقیت رکھتا ہے، نظام زکواۃ ان میں سے ایک ہے۔ ہر مذہب نے اپنے ماننے والوں کو کسی نہ کسی طور پر یہ ترغیب دی ہے کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کی دیکھ بھال اور فلاح و بہبود کے لئے کچھ نہ کچھ خرچ کرتے رہیں۔ اس سلسلے میں اسلام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ایک طرف تو اس مالی مطالبے کو اللہ کی طرف سے فریضہ قرار دیا اور دوسری طرف اسے صرف رضا کارانہ صدقات و خیرات کی حیثیت ھی میں نہیں رہنے دیا بلکہ اسے باقاعدہ ایک مالی نظام کی شکل دے کر اس کی وصولی اور خرچ کے انتظام کا کام مسلمانوں کی حکومت پر بطور فرض عائد کیا۔

اسلام نے جہاں حکومت اور اھل حکومت کو اتنے وسیع حقوق و اختیارات دیئے ھیں کہ زکواۃ جیسے مالی فریضے کی ادائیگی کو حکومت کی وصولی کے ساتھ مشروط کر دیا، وھاں حکومت پر یہ ذمہ داری ایک فرض کی طرح عائد کی کہ وہ مسلمانوں کی تمام بنیادی ضروریات زندگی کا انتظام کرے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی جس آیت کریمہ نے زکواۃ کی ادائیگی کو ”فریضۃ من اللہ“ اللہ کی طرف سے فریضہ قرار دیا ہے، اسی آیت نے حکومت کی ان ذمہ داریوں کا بطور فرض تعین کیا ہے، جو زکواۃ کی وصولی کے بعد عامۃ المسلمین کی طرف سے اس پر عائد ھوتی ھیں۔ لیکن حقوق و فرائض کے اس بیان میں سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ عوام و حکومت دونوں کی ایک دوسرے پر ذمہ داریاں

''فریضہً من اللہ'' اللہ کی طرف سے فریضہ کےطور پر عائد کی گئی ہیں۔ یعنی جس طرح صاحب نصاب مسلمانوں پر اللہ کی طرف سے یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال میں سے حکومت کو زکواۃ ادا کریں ، اسی طرح حکومت پر بھی اللہ کی طرف سے یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ ان فرائض اور ذمہ داریوں کو ایک فریضہ کی حیثیت سے پورا کرے جو اس پر مسلمانوں کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے عائد کی ہیں ۔ زکواۃ کے سلسلہ میں ہماری معلومات کی حد تک ، ہمیشہ اس بات پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ مسلمان زکواۃ کو ایک فریضہ کے طور پر ادا کریں ۔ لیکن نظام زکواۃ کے اس پہلو پر بہت کم دھیان دیا گیا کہ ''فریضہً من اللہ'' کا اطلاق حکومت پر بھی اسی طرح ہوتا ہے ، جس طرح عامۃ المسلمین پر ۔

پچھلے صفحات میں ہم نے حکومت کے حقوق اور عامۃ المسلمین کے فرائض کا جائزہ لیا ہے ۔ اب حکومت کے فرائض اور عامۃ المسلمین کے حقوق کا جائزہ لیا جاتا ہے ۔ سورہ التوبہ کی ساٹھویں آیت میں ان فرائض کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو زکواۃ کی وصولی کے بعد حکومت پر عائد ہوتے ہیں :۔

انما الصدقات للفقرآء و المساکین و العاملین علیھا و المؤلفۃ قلوبھم و فی الرقاب و الغارمین و فی سبیل اللہ و ابن السبیل ط فریضہً من اللہ ط و اللہ علیم حکیم (۹ : ۶۰)

صدقہ کا مال (یعنی مال زکواۃ) تو اور کسی کے لئے نہیں ہے ۔ صرف فقیروں کے لئے ہے ۔ اور مسکینوں کے لئے ہے ۔ اور ان کے لئے جو اس کی وصولی کے کام پر مقرر کئے جائیں ۔ اور وہ کہ ان کے دلوں میں (کلمہ حق کی) الفت پیدا کرنی ہے ۔ اور وہ کہ ان کی گردنیں (غلامی کی زنجیروں میں) جکڑی ہیں (اور انہیں آزاد کرانا ہے) ۔ نیز قرضداروں کے لئے (جو قرض کے بوجھ سے دب

گئے ہوں ، اور ادا کرنے کی طاقت نہ رکھیں) اور اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لئے اور ان تمام کاموں کے لئے ، جو مثل جہاد کے اعلاء کلمہ حق کے لئے ہوں) اور مسافروں کے لئے (جو اپنے گھر نہ پہنچ سکتے ہوں اور مفلسی کی حالت میں رہ گئے ہوں) یہ اللہ کی طرف سے ٹھہرائی ہوئی بات ہے اور اللہ (سب کچھ) جاننے والا (اپنے تمام حکموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

آیت میں مذکورہ مصارف زکواۃ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم نے انتہائی اعجاز کے ساتھ اس طبقے کی نشاندھی کر دی ہے جسے جدید اصطلاح میں (Have Nots) معاشی بد حال کہا جاتا ہے۔ تاریخی عوامل کے سبب حالات میں جو تغیر و تبدل پیدا ہوتا رہتا ہے ، اس کی وجہ سے (Have Nots) محتاج طبقے کی احتیاج کی شکلیں اور ان کے معیار میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے ، لیکن قرآن حکیم نے اس طبقے کی جن عام اور بنیادی باتوں کا ذکر کیا ہے ، وہ ہمیشہ سے ایک اور ہمہ گیر رہی ہیں ، وہ ہیں :

معاشی بدحالی ، محتاجی اور ناداری (للفقراء و المساکین)

غلامی (فی الرقاب)

قرض و تاوان اور دیوالیہ (الغارمین)

تعلیم اور دفاع (فی سبیل اللہ)

سفر کی سہولتیں وغیرہ (ابن السبیل)

قرآن نے اگر چہ دو اور مدوں، زکواۃ کے کلکٹر اور تالیف قلب ، کا ذکر بھی کیا ہے لیکن یہ وہ مدیں ہیں جن کی حیثیت مذکورہ چھ مدوں کے متعلقات کی ہے۔ اس لئے اصل اور بنیادی مدیں چھ ہیں۔ اب اگر ان چھ مدوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بنیادی طور پر وہ دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ ایک

معاشی و اقتصادی بدحالی کا استئصال اور دوسرے ملکی دفاع۔ گویا مسلمان حکومت پر زکواۃ کی وصولی کے بعد اللہ کی طرف سے جو فریضہ عائد ہوتا ہے، اس کی ادائیگی کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہوا کہ ملک سے اقتصادی و معاشی بدحالی کا استئصال کرے اور ملک کی حفاظت کی خاطر انتہائی مضبوط و طاقت ور اور زبردست دفاعی انتظامات کرے، اور حکومت جب تک ملک سے ہر قسم کا افلاس، احتیاج، کسان اور مزدور کو زمیندار اور کارخانہ دار کی غلامی سے آزادی اور ہر قسم کی معاشی و اقتصادی بدحالی کا استئصال کر کے ہر مسلمان کو باعزت اور خوش حال شہری نہ بنائے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد شدہ فریضہ من اللہ کی ادائیگی سے عہد برآ نہیں ہوسکتی۔ اور اسلام کے ان دو بنیادی مطالبوں کی تکمیل کے بغیر حکومت جو کچھ بھی کرے، خدا کی طرف سے عائد شدہ ان فرائض کی ادائیگی کا بدل ہر گز نہیں ہوسکتا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ مسلسل اور مستقل طور پر حکومت پر واجب الادا رہے گا کہ معاشی و اقتصادی بدحالی کا استئصال اللہ کی طرف سے فریضہ ہے جسے ابھی تک حکومت نے ادا نہیں کیا۔

قرآن حکیم نے زکواۃ کو اتنی اہمیت دی ہے کہ جہاں کہیں اقاموا الصلواۃ (نماز کو قائم کرو) کا حکم ہے اس کے ساتھ ہی وآتوا الزکواۃ (زکواۃ ادا کرو) کا حکم موجود ہے۔ اور اقامت صلواۃ اور ایتاء زکواۃ کا حکم جس تکرار و اصرار کے ساتھ قرآن میں مذکور ہے، کوئی دوسرا حکم اس تکرار و اصرار کے ساتھ موجود نہیں۔ پورے قرآن حکیم کی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کتاب اللہ کی تعلیمات کا محور دراصل اقامت صلواۃ اور ایتاء زکواۃ ہی ہیں۔ ایتاء زکواۃ (حقوق انسانی کی ادائیگی اور حسن معاملگی) اور اقامت صلواۃ (عبادات الٰہی کی ادائیگی) اللہ کی نگاہ میں دونوں ایک ہی درجہ رکھتے ہیں، اور اجر و ثواب اور اہمیت و مقام کے اعتبار سے اقامت صلواۃ

۱۸۱۵۲

(عبادات کی ادائیگی) ایتاء زکواۃ (معاملات انسانی کی حسن ادائیگی) پر کسی طرح بھی فوقیت نہیں رکھتی ، بلکہ قرآن حکیم کی تعلیمات کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عبادات الٰہی ، معاملات انسانی کی حسن ادائیگی کا ذریعہ بتائی گئی ھیں ، اور اگر عبادات کی ادائیگی سے انسانی حقوق و فرائض کی حسن ادائیگی پیدا نہیں ھوتی تو قرآنی شہادت کے مطابق محض عبادات کی ادائیگی عابد کو جہنم میں جانے سے روک نہیں سکتی ۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم سے ایسی احادیث مروی ھیں جن کا مفہوم یہ ھے کہ انسانوں کو چاھئیے کہ وہ انسانی حقوق و فرائض کا زیادہ خیال رکھیں ، اس لئے کہ اللہ انھیں معاف نہیں کرے گا ۔ ھاں البتہ عبادات میں کوتاھی کو معاف کر سکتا ھے ۔ کتنی بدقسمتی ھے کہ آج مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات کی ترتیب کو بالکل الٹ دیا اور انسانی حقوق و فرائض اور معاملات انسانی کو پرکاہ کی حیثیت دیئے بغیر عبادات کی رسمی ادائیگی کو نجات کا واحد ذریعہ سمجھ لیا ھے ، ھم حرام و حلال کی پروا کئے بغیر دن رات مال جمع کرنے اور عبادات کی رسمی ادائیگی کو حرام کے نوش جان کرنے کے لئے جواز قرار دیتے ھیں ۔

یوں تو ھر مذھب نے اپنے ماننے والوں کو تلقین کی ھے کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کی مدد کریں ، لیکن اسلام نے اسے بطور خاص اتنی اھمیت دی کہ عبادات کی ادائیگی کو معاملات میں حسن ادائیگی کا ذریعہ قرار دے دیا ۔ بات یہ ھے کہ فقر و افلاس اور ناداری و محتاجی دراصل انسان کو ذلت و مسکنت کے پست گڑھے میں گرا کر رھتی ھے اور انسان کی انسانیت پر بدنما داغ بن کر اسے ھمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رکھتی ھے ، نتیجۃً انسان کی تخلیقی قوتیں تباہ ھو جاتی ھیں ، اور وہ تخلیق و تعمیر کے جوھر سے عاری ھو کر تقلید و غلامی کی روش اختیار کرنے پر مجبور ھو جاتا ھے ۔ قرآن انسان کو اس ذلت و پستی کی حالت میں دیکھنا پسند نہیں کرتا ۔ قرآن کی نظر میں انسان

کا مقام نہایت بلند و ارفع ہے: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (۹۵ : ۴)۔ قرآن، انسان کے اندر خدائی صفات، تخلیق و تعمیر، دیکھنے کا متمنی ہے: اور اسے مسلسل بلندیوں کی طرف پرواز کرتے دیکھنا چاہتا ہے۔ چونکہ مفلسی، محتاجی اور غلامی ایسی لعنتیں ہیں جو انسان کی تخلیقی و تعمیری قوتوں کی تباہی کا سبب بنتی ہیں، اس لئے اسلام نے بطور خاص ان پر توجہ دی ہے۔

قرآنی تعلیمات کی رو سے جس ملک یا معاشرے میں ظلم کی وجہ سے فقر و احتیاج موجود ہو وہ شیطانی معاشرہ ہے اور جس ملک یا معاشرے میں خوش حالی و فارغ البالی ہو وہ رحمانی معاشرہ ہے۔ قرآن حکیم نے اس صورت حال کو ایک نہایت جامع اور عمدہ انداز میں یوں بیان کیا ہے :۔

الشیطان یعدکم الفقر و یامرکم بالفحشاء ج واللہ یعدکم مغفرۃ منه و فضلاً ط۔ (۲ : ۲۶۸)

شیطان تمہیں تنگ دستی و مفلسی کا وعدہ دیتا ہے، اور ایسے کاموں کی ترغیب دیتا ہے جن سے معاملات انسانی میں فساد بپا ہو، اور اللہ تمہیں اپنی طرف سے مزید بخشش اور خوش حالی کا وعدہ دیتا ہے۔

اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ شیطان کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ مالدار طبقے کے دلوں میں فقر و افلاس کا خطرہ پیدا کر کے مفلسی، تنگ دستی، ناداری اور محتاجی کو معاشرے میں برقرار رکھے۔ قرآن حکیم نے فقر و احتیاج کو برقرار رکھنے کے شیطانی اغراض و مقاصد بھی بیان کر دیئے، وہ یہ کہ مفلس و نادار اور معاشی طور پر محتاج و غلام افراد کو آسانی سے ایسے کاموں پر لگایا جا سکتا ہے جن سے معاشرے میں فساد بپا ہو۔ چوری، ڈاکہ، اغوا، لڑائی جھگڑا، فساد، مایوسی، نا امیدی، سستی، کاہلی اور فحاشی وغیرہ بڑھے (و یامرکم بالفحشاء) یہی وجہ ہے کہ جس معاشرے میں جتنی

زیادہ مفلسی و ناداری اور فقر و محتاجی ہو گی اتنا ہی زیادہ اس معاشرے میں شیطان کا عمل دخل ہوگا۔ اور اسی اعتبار سے ایک محتاج و فقیر معاشرہ شیطان کا معاشرہ ہوگا۔ اگرچہ اس معاشرے کے لوگ کتنے ہی ظاہری عبادات کے خوگر کیوں نہ ہوں (فویل المصلین)، اس کے مقابلے میں وہ معاشرہ جس میں معاشی خوش حالی ہو وہ رحمانی معاشرہ ہے، اس لئے کہ خود خدائے رحمان نے فرمایا ہے: واللہ یعدکم مغفرۃ منہ و فضلاً (اللہ تعالیٰ تمہیں، اس کے حکم کے مطابق حقوق انسانی ادا کرنے کے عوض، اپنی طرف سے بے پایاں بخششیں عطا کرنے اور اقتصادی خوش حالی کا وعدہ دیتا ہے) یہ آیت نہایت واضح الفاظ میں بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو فقر و احتیاج کی بجائے مسلمانوں کی خوش حالی زیادہ پسند ہے۔ اور عسرت و تنگ دستی اور فقر و احتیاج کا استئصال کرنا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اسی لئے اس سے پہلے والی آیت میں اسی افلاس و معاشی تباہ حالی کو ختم کرنے کے لئے مومنین کو اپنے مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

یایھا الذین امنوا انفقوا من طیبت ماکسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض (۲ : ۲٦۷)

(مسلمانو! جو کچھ تم نے (محنت مزدوری یا تجارت سے) پاکیزہ کمائی کی ہو، اس میں سے خرچ کرو اور اس میں سے جو کچھ ہم نے تمہارے لئے زمین میں سے نکالا ہے)۔ فقر و احتیاج کا استئصال اور خوش حالی کا قیام وہ معیار ہے، جس کے نتیجے میں رحمانی و شیطانی معاشروں کی تمیز کی گئی ہے۔ یعنی جو نظام اللہ کے اس حکم کے تحت اپنے معاشرے میں دولت کے عدم توازن کو ختم کر کے ایک خوشحال معاشرہ قائم کر لیتا ہے وہ تو رحمانی نظام کہلائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے: ان وعد اللہ حق (۳۵ : ۵) اور جو نظام

شیطان کے حکم کی منشاء کے تحت معاشرے میں مالداروں اور محتاجوں کے طبقات کو دولت کے عدم توازن کے ساتھ بر قرار رکھتا ہے وہ شیطانی قرار پائے گا۔

فقر و احتیاج اور غربت و افلاس اسلام کی نظر میں اتنی مہلک بیماریاں ہیں کہ جو لوگ ان بیماریوں سے ملک و معاشرے کو محفوظ رکھنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود اس میں کوتاہی کرتے ہیں انہیں محض اسی جرم کے ارتکاب کی بنا پر جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ سورہ الماعون کے مطابق ایسے بناوٹی دین دار کو (الذی یکذب بالدین) جو دین کو محض نماز وغیرہ کی ادائیگی تک محدود سمجھتا ہے، اور یتیمی، مسکینی اور غربت و افلاس کو دور نہیں کرتا جہنمی قرار دیا گیا ہے۔ سورہ ھمزہ نے ایسے دین داروں کو ان الفاظ میں جہنم کی وعید دی ہے :۔ جہنمی ہیں وہ لوگ جو مال و دولت کو ادھر ادھر سے سمیٹتے ہیں اور اسے گن گن کر جمع کرتے جاتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ اس طرح کی سمیٹی ہوئی دولت انہیں ہمیشہ کی زندگی بخش دے گی۔ دیکھو! ایسا نہیں ہے بلکہ انہیں تو روند ڈالنے والے جہنم میں پھینکا جائے گا، اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ روند ڈالنے والا جہنم کتنا دردناک ہے، وہ تو در اصل ایک دھکتا سلگتا جہنم ہے جس کی آگ کو خود اللہ تعالیٰ نے (ایسے سرمایہ داروں کے لئے) سلگا رکھا ہے۔ یہ آگ سرمایہ داروں کے ارادوں کو ان کے دلوں میں جھانک کر معلوم کر سکتی ہے، جو انہوں نے غربت و افلاس کو باقی رکھنے کے لئے دولت کے جمع و احتکار کی خاطر دلوں میں چھپا رکھے ہیں۔ فقر و احتیاج کی موجودگی میں سرمایہ دار مجرمین کو اس دھکتی آگ کے جہنم میں ڈال کر اس کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے اور سرمایہ دار مجرمین کے لئے نکلنے کا کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا جائے گا، اور وہ آگ کے شعلوں کے لمبے لمبے ستونوں کے درمیان جکڑ دیئے جائیں گے :۔

ویل لکل همزة لمزة ہ الذی جمع مالا و عددہ یحسب ان مالہ
اخلدہ کلا لینبذن فی الحطمہ وما ادراک ما الحطمہ نار اللہ الموقدة
التی تطلع علی الافئدة انہا علیہم موصدة فی عمد ممددة (۱۰۴: ۹-۱)

بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کے لئے جو پس پشت عیب نکالنے والا ہو (اور) طعنہ دینے والا ہو جو (غایت حرص سے) مال جمع کرتا ہو اور (غایت حب و فرح سے) اس کو بار بار گنتا ہو۔ وہ خیال کر رہا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے گا۔ ہرگز نہیں رہے گا۔ وہ شخص ضرور ایسی آگ میں ڈالا جائے گا جس میں جو کچھ پڑے وہ اس کو توڑ پھوڑ دے اور آپ ص کو (اے رسول ص) کچھ معلوم ہے کہ وہ توڑنے پھوڑنے والی آگ کیسی ہے؟ (جو اللہ کے حکم سے سلگائی گئی ہے جو (کہ بدن کو لگتے ہی) دلوں تک جا پہنچے گی (اور) وہ (آگ) ان پر بند کر دی جائے گی (اس طرح کہ وہ لوگ آگ کے) بڑے امبے لمبے ستونوں میں (گھرے ہوں گے)۔

قرآن حکیم کی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو جرم جنہیں، خدائی حکومت میں انتہائی غداری اور سب سے بڑی بغاوت قرار دیا گیا ہے۔ شرک اور غربت و افلاس کی موجودگی میں سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ شرک اللہ تعالیٰ کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا ہے اور غربت و افلاس کی موجودگی میں جمع و احتکار دولت، بنی نوع انسان کے حقوق کو غصب کرنا ہے۔ شرک کے ناقابل معافی جرم ہونے کے سلسلے میں تو قرآن حکیم شروع سے آخر تک گواہ ہے۔ اسی طرح ایسے مال داروں اور سرمایہ داروں کو جو غربت و افلاس کی موجودگی میں جمع و احتکار دولت میں مصروف ہوں، قرآن نے ان الفاظ میں عذاب جہنم کی بشارت دی ہے۔

یاایہا الذین امنوا ان کثیراً من الاحبار و الرھبان لیاکلون اموال الناس

بالباطل و یصدون عن سبیل اللہ والذین یکنزون الذھب و الفضۃ
ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم یوم یحمٰی علیھا فی نار جھنم
فتکوٰی بھا جباھھم و جنوبھم و ظھورھم ھذا ما کنزتم لانفسکم
فذوقوا ما کنتم تکنزون (۹ : ۳۴ ، ۳۵)

(اے ایمان والو ! اکثر احبار اور رھبان ، لوگوں کے مال ناجائز طریقہ سے کھاتے ھیں اور اللہ کی راہ سے باز رکھتے ھیں اور (غایت حرص سے) جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ھیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو آپ ان کو ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجیئے جس دن ان کی جمع کردہ دولت کو جہنم کی آگ میں تاپا جائے گا پھر ان کی پیشانیوں ، پہلوؤں اور پیٹھوں کو اس سے داغا جائے گا اور کہا جائے گا یہ ہے وہ کچھ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا ، چکھو سزا اس دولت کا جسے تم جمع کرتے رہتے تھے -

قرآن حکیم کی نظر میں ، شرک اور فقر و احتیاج کی موجودگی میں سرمایہ داری ، دونوں خدائی مملکت کے خلاف غداری اور بغاوت کے مترادف ھیں ، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے علاوہ ھر جرم کو معاف کر دینے کا حق محفوظ رکھا ھے ، لیکن ان دونوں یا ان دونوں میں سے کسی ایک کے مرتکب کو ناقابل معافی مجرم قرار دیا ھے اور دونوں کی سزا یہ رکھی ھے کہ وہ ابدالاباد تک جہنم میں سلگتے رھیں (خالدین فیھا ابداً) -

چنانچہ جرم و سزا کی اس زبردست وعید کی بنا پر کتاب اللہ ، سنت رسول اللہ ، عمل خلفاء راشدین اور علماء و صلحاء امت نے اسلام کے اس پہلو کو بطور خاص اھمیت دے کر مسلم معاشرے میں افلاس اور فقر و احتیاج کے استئصال کے لئے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا ، لیکن اب سوال یہ ھے کہ ھمارا ماضی ، ھمارے موجودہ مسائل کو حل کرنے میں ھماری کس طرح مدد

کر سکتا ہے ؟ اور پھر اس سوال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ماضی کی کس چیز سے ہمیں رہنمائی حاصل کرنا ہے ؟ ماضی کے معاشرتی و معاشی حالات سے یا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ؟ جب تک موجودہ دور کے مسلمان اس آخری پہلو کا پوری طرح تجزیہ کر کے کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچتے کسی بھی معاشی مسئلے کا حل نا ممکن ہے۔ ہمارے خیال میں وہ چیز جو غیر متبدل اور ابدی رہنما اصولوں کی حیثیت رکھتی ہے ، وہ ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔ رہ گئے وہ حالات ، جن میں قرآنی تعلیمات کا نزول ہوا اور جن میں رسول اللہ صلی اللہ عیہ و سلم نے ان تعلیمات کو نافذ کیا ، تو وہ تغیر پذیر تھے ، خود حیات مبارکہ کے ۲۳ سالوں میں وہ بہت حد تک بدلے اور مسلسل تبدیل ہو رہے ہیں ، اس لئے یہ خیال کرنا کہ معاشرت و تمدن اور اقتصادیات و معاشیات میں ساتویں صدی عیسوی کے بعد سے اب تک کوئی تبدیلی نہیں آئی ، نہ صرف یہ کہ عقل و خرد ، تجربات و مشاہدات اور تاریخی واقعات کا منہ چڑانا ہے بلکہ قرآنی تعلیمات کی بھی کھلم کھلا توہین اور تضحیک کرنا ہے ، اس لئے کہ قرآن حکیم نے خود بیشتر آیات میں قوموں کے عروج و زوال اور حالات و واقعات میں تغیر و تبدل کے اسباب و علل بیان کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح معاشرے نے ان رہنما اصولوں کو پس پشت ڈالا اور اس کے نتیجے میں کس قسم کے معاشرتی و معاشی اورسیاسی حالات سے دو چار ہوا (تلک الایام نداولہا بین الناس) لہذا ماضی سے ہمیں صرف خدا کی تعلیمات اور اس کے رسول ص کی سنت ہی میں رہنمائی مل سکتی ہے۔ نہ کہ ان حالات کو دوبارہ پیدا کرنے کا خواب دیکھنے سے۔ کسی وقت کے تاریخی حالات ، کسی دوسرے وقت میں بعینہ دھرائے نہیں جا سکتے ، لیکن اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلعم کی سنت حالات سے بالاتر ہیں۔ اس لئے ان کا نفاذ ہر حال میں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ

یہی وجہ ہے کہ حالات میں تغیر و تبدل کی وجہ سے فقر و احتیاج اور مفلسی و تنگدستی کے معیار بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے انسان کی یہ حالتیں اضافی ہیں۔ اس پس منظر میں ہمیں اپنے موجودہ معاشی مسائل کا حل تلاش کرنا ہے۔

اس وقت جب ہم اپنے معاشرے کا تجزیہ کرتے ہیں۔ تو قرآن حکیم کے بیان کردہ مصارف ہمارے معاشرے میں ان صورتوں میں نظر آتے ہیں۔ ۱ - بیکاری ، ۲ - معاشی غلامی ، ۳ - جہالت ، ۴ - بیماری - چنانچہ یہ وہ چار بیماریاں ہیں جو اس وقت ہمارے ملک و معاشرے کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں ، اور یہی فقر و احتیاج کی وہ موجودہ صورتیں ہیں جو خدا اور رسول ؐ کو شرک کی طرح انتہائی مکروہ اور نا پسندیدہ ہیں ، اور جب تک ان کا معاشرے سے مکمل طور پر انسداد نہ ہو جائے اور انہیں پاکستان کی سر زمین سے پوری طرح بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک نہ دیا جائے ، خدا اور رسول صلعم ہم سے راضی نہ ہوں گے اور ان کی ناراضی کے نتیجے میں ہم اس وقت تک اللہ کے عذاب میں مبتلا رہیں گے جب تک کہ ہم ان انتہائی مضرت رساں ، اور سڑی ہوئی بیماریوں کے وجود سے اپنے ملک عزیز کو پوری طرح نجات نہیں دلا دیتے - خدا وند قدوس کبھی ایسی قوم سے راضی نہیں ہوتے جو دائمی اور تباہ کن بیماریوں میں مبتلا ہو اور وہ اپنے آپ کو تندرست سمجھے - بیماریاں اس کی تمام تخلیقی و تعمیری صلاحیتیں بے کار کرنے میں مسلسل مصروف ہوں اور وہ ان کا شعور بھی نہ رکھے ، اللہ اور اس کا رسول ؐ ایسی قوم سے کیسے محبت کر سکتے ہیں جو ان تباہ کن بیماریوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مجتہدانہ طرز فکر کھو چکی ہو ، جو عزت نفس جیسے اعلیٰ جوہر سے عاری ہو کر احساس کمتری جیسے مہلک مرض کا شکار ہوگئی ہو ، جسے تعمیر

و ترقی کی طرف قدم اٹھانے کی بجائے رجعت پسندی اور تقلید و غلامی زیادہ عزیز ہو۔

قرآن حکیم کی تعلیمات گواہ ہیں کہ یہ سب تباہ کن بیماریاں اس معاشی غلامی کا نتیجہ ہوتی ہیں، جو عقل و فکر اور تدبر و تفکر کی صلاحیتوں کو تباہ کر کے ان کے لئے سہلک بیماریوں کا راستہ صاف کرتی اور پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس کی تعمیر و ترقی اور تخلیقی و اخلاقی قوتوں کو بے کار کر کے اسے بالکل اپاہج بنا دیتی ہے نیز دوسری اقوام کے آگے انہیں لاچار، نڈھال اور بے یار و مدد گار شکار کی طرح ڈال دیتی ہے۔ جس کے بعد مجبور قوم کی اخلاقی و تخلیقی قوتوں کا دار و مدار استعمار کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ جس حد تک چاہتی ہیں انہیں زندگی عطا کرتی ہیں، اور جس حد تک چاہتی ہیں ان سے زندگی چھین کر انہیں موت کی طرف لوٹا دیتی ہیں، اور یہ مجبور و مقہور قوم اپنی اخلاقی و تعمیری قوتیں کھو کر، بھیک اور گدائی کو اپنا شیوہ بنا لیتی ہے۔

ہر قسم کی غلامی کو قرآن نے ''و فی الرقاب'' کا نام دیا ہے۔ زوال و انحطاط سے دو چار معاشرے عام طور پر خود غرض اور استحصال پسند اہل ثروت، علمائے سوء اور ضلالی اہل مذہب اور ظالم و مستبد اہل حکومت کے غلام ہوتے ہیں۔ استحصال پسند اہل ثروت، دولت اور ذرائع دولت کے اجارہ دار بن کر پوری قوم کو بیکاری میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ علمائے سوء اور ضلالی اہل مذہب اپنی علم دشمن روش کی بنا پر عوام کی گردن میں جہالت کا طوق پہنا دیتے ہیں۔ ظالم و مستبد اہل حکومت ظلم واستبداد کو اپنا شیوہ بناتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں قوم، رشوت، سفارش، فریب اور بد دیانتی

جیسی بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ ان طبقوں کی تخریبی کاروائیوں کے سبب، عوام ایک طرف قومی سطح پر بیکاری، جہالت اور بیماری کا شکار ہوجاتے ہیں، تو دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر وہ بالترتیب معاشی استعماریت، ثقافتی استعماریت اور سیاسی استعماریت کے شکنجوں میں پھنس جاتے ہیں۔ اس پوری فکر کو مختصر طور پر مندرجہ ذیل شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے:-

وفی الرقاب

معاشی استعماریت
بیکاری
اہلِ ثروت
مسلمان عوام
اہلِ حکومت
اہلِ مذہب
بیماری
جہالت
سیاسی استعماریت
ثقافتی استعماریت
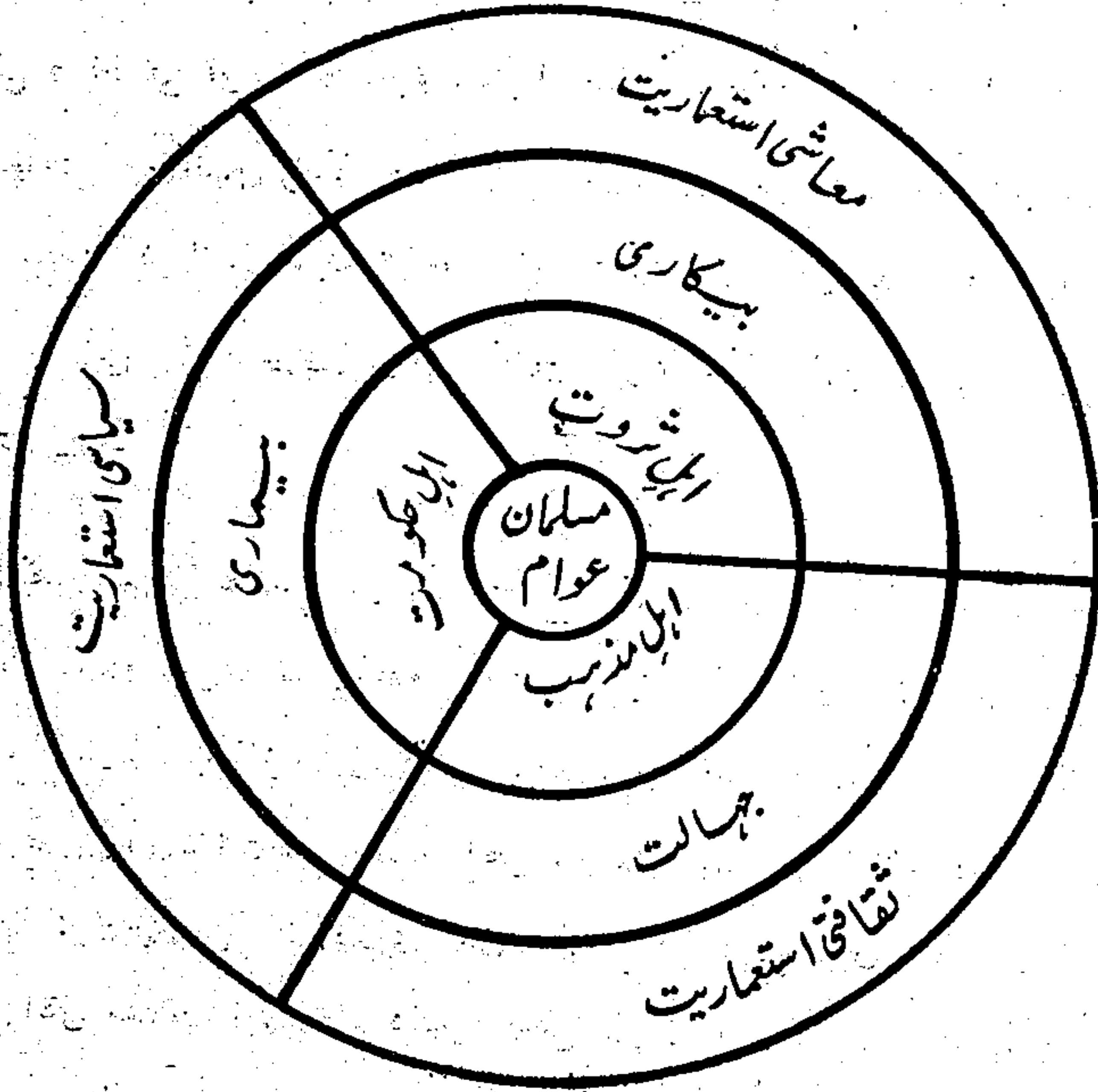
مسئلۂ بے کاری اور اُس کا حل

ہم نے معاشرتی و اقتصادی تجزیہ کے بعد جدید حالات کی روشنی میں مصارف زکواۃ کو بےکاری ، معاشی غلامی ، جہالت اور بیماری کی چار مدات میں تقسیم کیا ہے۔ اگر چہ اپنی ہلاکت کے اعتبار سے چاروں کا انسداد نہایت ضروری ہے ، تا ہم سہولت کے لئے معاملات میں ترجیح (Priority) کے اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم بےکاری کے مسئلہ کو اولیت و اہمیت دیتے ہیں ۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ جو لوگ معاشی غلامی ، جہالت یا بیماری میں مبتلا رہنے پر بھی کسی نہ کسی طور زندہ ہیں ، ان پر ایسے لوگوں کو بہر حال ترجیح دی جائے گی جنہیں اتنا بھی میسر نہیں کہ وہ زندہ ہی رہ سکیں ، چونکہ زندگی کے بعد ہی باقی خواہشات کی تکمیل کا سوال پیدا ہوتا ہے اس لئے بقائے حیات کو دوسری تمام ضروریات و خواہشات پر ترجیح دی جائے گی ۔

قرآن حکیم نے اس مسئلہ کی اہمیت کو نہایت خوبی اور عمدگی کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے :

انہ من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً ط و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاً ہ (۵ : ۳۲) ۔

اس آیت کے پہلے ٹکڑے میں دو جرم بیان ہوئے ہیں ، جن میں سے ایک یا دونوں کے ارتکاب کو ” قتل الناس جمیعاً “ پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا

ہے۔ پہلا جرم ہے ”قتل نفس بغیر نفس“ اور دوسرا جرم ہے ”قتل نفس بغیر فساد فی الارض“۔ قتل نفس سے مراد ہے، کسی انسان کو کسی آلے اور ہتھیار وغیرہ سے اس طرح مارنا کہ وہ اس کی ضرب سے فوری طور پر ہلاک ہو جائے یا بعد میں اس کی ضرب یا زخم اس کی موت کا سبب بنے۔ اور فساد فی الارض سے مراد کسی فرد یا گروہ کا ایسے ناسازگار حالات پیدا کرنا ہے جو دوسرے افراد یا اقوام کے لئے اقتصادی و معاشی یا کسی اور قسم کی ہلاکت کا باعث بنیں، گویا کسی فرد کا کسی فرد کو ایک دم قتل کر دینا یا اس کی ہلاکت کے لئے ایسے معاشی و اقتصادی اسباب پیدا کر دینا جن سے بتدریج وہ موت کی نذر ہو جائے، قرآنی الفاظ میں ”قتل الناس جمیعاً“ پوری انسانیت کی ہلاکت کے مترادف ہے۔ بےکاری ایک ایسا مسئلہ ہے جو انسان کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے کیونکہ جب تک کسی شخص کو روزگار میسر نہ ہو وہ اپنے آپ کو اور اپنے اهل و عیال کو زندہ نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے وہ افراد یا گروہ جو ملک میں بےکاری کا مسئلہ پیدا کرتے ہیں یا دولت اور ذرائع آمدن کا اس طرح استحصال کرتے ہیں کہ معاشرے میں بیکاری پیدا ہو، جو نتیجۃً بےکار انسانوں کی ہلاکت کا باعث بنے، قرآنی حکم کے مطابق قاتل انسانیت ہیں۔ مثلاً دور جدید میں جاگیردار، کارخانہ دار اور سرمایہ دار، اپنی زمینوں، جائدادوں اور کارخانوں کے بے جا تصرف سے دولت اور ذرائع دولت پر قابض ہو کر ایسا چکر چلاتے ہیں کہ دولت ہر طرف سے گھوم پھر کر ان کے پاس ہی جمع ہوتی رہتی ہے۔ اور اس طرح ملک کا ایک اقلیتی طبقہ، ملک کے اکثریتی عوام کو دولت اور ذرائع دولت سے محروم کرکے ان کے لئے بےکاری کا مسئلہ پیدا کر دیتا ہے۔ قرآن حکیم جو انسانیت کی رہنمائی کے لئے جامع وهمہ گیر اصولوں کا مجموعہ ہے، دولت اور ذرائع دولت کے بےجا تصرف پر بڑے اعجاز کے ساتھ

هدایت دیتا ہے کہ اسلامی نظام معیشت میں دولت و ذرائع دولت کو معاشرے کی اکثریت کے مفاد سے نکال کر ایک مخصوص اقلیت کے دست تصرف میں محصور نہیں کیا جا سکتا ''کی لا یکونَ دولۃً بین الا غنیاء منکم (۵۹ : ۷) تاکہ دولت محض تمہارے سرمایہ داروں کی بن کر نہ رہ جائے ۔ اور اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ خداوند تعالیٰ کی ان واضح اور صاف ہدایات کے باوجود جاگیردار ، صنعت کار اور سرمایہ دار مختلف حیلوں سے دولتِ خود ھی سمیٹتے جائیں اور ذرائع پیداوار پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں تو قرآن مجید نے ایک دوسرے حکم کے تحت ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لئے بھی واضح الفاظ میں رہنمائی فرمائی ہے ۔ حکم ھوا : و فی اموالھم حق معلوم للسائل و المحروم (۷۰:۲۴،۲۵) جاگیرداروں کی جاگیروں ، کارخانہ داروں کے کارخانوں ، سرمایہ داروں کی دولت اور سرمائے میں ان لوگوں کا باقاعدہ مقررہ حصہ (حق معلوم) موجود ہے جنہیں جاگیرداری ، صنعت کاری و سرمایہ داری نظام نے بذریعہ استحصال دولت ، معاشی و اقتصادی طور پر بے کار اور محروم کر دیا ہو ، چنانچہ قرآن حکیم کی اس آیت نے اسلامی ریاست کو یہ اختیار دیا ہے کہ جب مسلمان جاگیردار ، صنعت کار اور سرمایہ دار اللہ تعالیٰ کے اس کلمہ کو پس پشت ڈال دیں ، کہ دولت تمہارے سرمایہ داروں کی بن کر نہ رہ جائے (کی لایکون دولۃً بین الاغنیاء منکم) تو حکومت بالجبر جاگیرداروں کی جاگیریں ، صنعت کاروں کی صنعتیں اور سرمایہ داروں کا سرمایہ اس حد تک ضبط کرلے جس حد تک وہ ملک سے بے کاری و محرومی دور کرنے میں مدد دے سکے اور آیندہ بے کاری اور محرومی پیدا نہ ھونے دے ۔ ''حق معلوم'' سے ایسا کم ازکم معاشی و اقتصادی تحفظ مراد ہے جس سے ایک زمانے کے انسان کی بنیادی ضروریات زندگی پوری ہو سکیں ۔ چنانچہ ''حق معلوم'' بنیادی ضروریات زندگی کی فراھمی کا یہ تصور قرآن مجید نے انسان کو اس وقت دیا جب کہ جدید معاشی نظریات کا کسی کو علم بھی نہ تھا ۔

ہم اوپر بیان کر رہے تھے کہ جو افراد یا گروہ استحصال دولت سے ایسے حالات پیدا کر دیں جن سے ملک میں بے کاری و محرومی عام ہو اور جو عامة المسلمین کی ہلاکت کا سبب بنیں تو ایسے افراد یا گروہ ''فساد فی الارض'' کے جرم کے مرتکب ہونے کی وجہ سے قرآنی حکم کے مطابق پوری انسانیت کے قتل کے مرتکب قرار پائیں گے، اگرچہ ''فساد فی الارض'' کی تعبیر وسیع مفہوم رکھتی ہے، تاہم دور جدید میں اس کی قبیح ترین صورت ملک میں بے کاری اور محرومی پیدا کرنا ہے، جس سے معاشرے میں اقتصادی بحران اور معاشی عدم توازن کی وجہ سے زبردست فساد پیدا ہو جاتا ہے، بیشتر سیاسی انقلابات، مزدوروں اور معاشی طور پر محروم لوگوں کے وسیع پیمانے پر فسادات، کی تہ میں عموماً معاشی و اقتصادی ناہمواری کار فرما ہوتی ہے۔ بنا بریں ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس وقت کا سب سے بڑا ''فساد فی الارض'' بے کاری اور محرومی ہے۔ خود قرآن حکیم نے ''فساد فی الارض'' کے مختلف اسباب و وجوہ کا ذکر کرتے ہوئے بےکاری اور محرومی کو سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔ سورۃ الفجر میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے ظلم و استبداد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: فاکثروا فیھا الفساد (۸۹ : ۱۲) انھوں نے ملک میں بہت فساد برپا کر رکھا تھا۔ اور فرعون اور اس کے حواریوں کے سلسلے میں ''فساد فی الارض'' کا سب سے بڑا مظاہرہ معاشی خوش حالی، جاہ و عظمت اور حشمت و جبروت تھا اور اسی معاشی و اقتصادی خوش حالی نے فرعون کو ''انا ربکم الاعلیٰ'' (۷۹:۲۴) ''میں ہوں تمہارا سب سے اعلیٰ رب'' کہنے کی جرأت دلائی تھی ایک دوسری جگہ قرآن حکیم نے اس سے بھی واضح الفاظ میں ''فساد فی الارض'' کو دولت اور ذرائع دولت کے استحصال کا نام دیا ہے۔ فرعون نے مصر کے ایک مخصوص طبقے کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے پورے ملک کی دولت اور ذرائع دولت پر قبضہ جما

رکھا تھا اور اس طرح ملک کی کثیر آبادی کو بے کاری و محرومی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رکھا تھا ۔ اس کثیر آبادی میں جو دن رات فرعون کی دولت میں اضافہ کرنے اور خود معاشی طور پر تباہ ہونے میں لگی ہوئی تھی ، بنی اسرائیل بھی تھے ، جن میں سے حضرت موسیٰ مبعوث ہوئے ، حضرت موسیٰ اور اپنا تقابل کرتے ہوئے فرعون نے کہا : و نادی فرعون فی قومه قال یاقوم الیس لی ملك مصر و هذه الانهار تجری من تحتی ، افلا تبصرون ام انا خیر من هذا الذی هو مهین ولا یکاد یبین فلولا القی علیه اسورة من ذهب او جاء معه الملئکة مقترنین فاستخف قومه فاطاعوه انهم کانوا قوماً فاسقین (۴۳ : ۵۰، ۵۲) ’’ اور پکارا فرعون نے اپنی قوم میں ، بولا : اے میری قوم : بھلا مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں نہیں اور میرے محلات کے نیچے نہریں جاری نہیں ، کیا تم دیکھتے نہیں ، بھلا میں اس شخص سے بہتر نہیں جو (معاشی طور پر) ذلیل و حقیر ہے اور صاف بول بھی نہیں سکتا ، (اگر واقعی یہ کوئی باعزت انسان ہوتا) تو پھر اس پر سونے کے کنگن کیوں نہ آپڑے یا اس کے ساتھ فرشتے پرا باندھ کر آتے ۔ اس طرح وہ اپنی قوم کے جذبات سے کھیلا اور وہ قوم اس کی فرمانبرداری میں لگی رہی ، بے شک وہ فاسق قوم تھی ۔

اس آیت نے فرعون (اور اس کے سرداروں) کے پورے ملک کی دولت و ذرائع دولت پر قابض ہوکر ملک کی کثیر آبادی کو جسمانی و معاشی طور پر غلام بنائے رکھنے اور اس طرح مصر کے نظام معیشت میں زبردست بحران پیدا کر کے ایک اقلیتی طبقہ کو اکثریتی آبادی پر معاشی برتری دینے ، معاشی ناهمواری اور اقتصادی عدم توازن پیدا کرنے کو ’’ فساد فی الارض ‘‘ قرار دیا ہے ۔

حضرت صالح علیه السلام کے قصه میں فرمایا : و کان فی المدینة تسعة رهط یفسدون فی الارض ولا یصلحون (۲۷ : ۴۸) ’’ اور اس شهر میں نو شخص

تھے جنہوں نے ملک میں فساد برپا کر رکھا تھا اور وہ اصلاح کی طرف مائل نہ تھے ''۔

یہ نو اشخاص جن کی طرف قرآن حکیم نے اشارہ کیا ہے، وہی لوگ تھے جنہوں نے اس معاشرے کی دولت اور ذرائع آمدن پر اجارہ داری جما رکھی تھی اور آپس کے گٹھ جوڑ سے باقی پوری آبادی کو اپنا دست نگر بنا رکھا تھا ۔ بعض مفسرین نے ان نو اشخاص کی نشان دھی آنحضرت صلعم کے ان نو مخالفین سے کی ہے جنہوں نے پورے مکہ کی معیشت پر قبضہ جما رکھا تھا اور وہاں کے باقی لوگوں کو بےکاری اور محرومی پر مجبور کر رکھا تھا ۔ ان کے نام یہ ھیں :۔ ابوجہل ، مطعم بن عدی ، شیبہ بن ربیعہ ، عتبہ بن ربیعہ ، ولید بن ربیعہ ، امیہ بن خلف ، نضر بن حرث ، عقبہ بن ابی معیط اور ابولہب ۔ تاریخ اسلام اور سیرت رسول ؐ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ھیں کہ کس طرح یہ نو افراد مکے کی معیشت پر غالب تھے اور ان کے غلبے اور اجارہ داری کی وجہ سے مکے کی معیشت میں وہ زبردست بحران پیدا ھو گیا تھا ، جس نے وہاں کی کثیر آبادی کو بے یار و مدد گار سائلین ، محرومین ، یتامیٰ و مساکین میں بدل دیا تھا اسی محروم طبقہ کی فلاح وبہبود کے لئے رضا کارانہ اور بطور فریضہ ، قرآن حکیم نے خرچ کرنے کی بار بار تلقین کی ہے ، گویا اس آیت نے بھی '' فساد فی الارض '' کی بدترین صورت بے کاری و محرومی اور معاشی غلامی ھی بیان کی ہے ۔

سورہ الاعراف میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے اس طبقے کا ذکر کیا گیا جو '' فساد فی الارض '' میں مبتلا تھا اور پھر '' فساد فی الارض '' کی وضاحت یوں کی کہ وہ طبقہ معاشی استحصال میں مصروف تھا اور اس کی بدترین صورت یہ تھی کہ وہ مزدور کا حق پورا ادا نہیں کرتا تھا اور محنت کش طبقے کے حقوق غصب کرنے کے لئے مختلف طریقے استعمال کرتا تھا اور اس طرح

اس نے معاشرے کی معیشت کو ایسے چکر میں ڈال رکھا تھا جس سے دولت گھوم پھر کر اس کے ہاں آجاتی اورعوام الناس ہمیشہ بے کار محروم اور معاشی غلام ہی رہتے تھے - قرآن حکیم نے اس صورت حال کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے : فاوفوا الکیل و المیزان ولا تبخسوا الناس اشیاء ھم ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا (۷ : ۸۵) (سو پورے کرو ماپ اور تول اور لوگوں کو ان کے حقوق گھٹا کر نہ دو اور ملک میں اصلاح ہونے کے بعد فساد نہ کرو) آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ '' الکیل '' '' والمیزان '' اور '' ولا تبخسوا الناس اشیاء ھم '' تینوں کے مجموعے کا نام فساد فی الارض ہے ، اور یہ تینوں چیزیں ملکی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ الکیل و المیزان سے مراد محض ماپ تول کے پیمانے نہیں بلکہ وسیع تر معنوں میں اس سے حقوق العباد کی پوری پوری ادائیگی ہے یعنی جو لوگ دولت و ذرائع دولت پر اجارہ داری جما کر عوام الناس کو بے کار اور محروم کر دیتے ہیں ، وہ الکیل و المیزان کو پورا نہیں کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں حکومت قانون و حقوق کے پیمانے استعمال میں لا کر بے کار و محروم لوگوں کی داد رسی کرے گی اور اقلیتی اجارہ دار طبقہ سے غصب شدہ حقوق لے کر ان کے مستحقین ، بے کار و محروم ، لوگوں میں تقسیم کر دے گی۔

'' فساد فی الارض '' سے مراد بے کاری ، اور معاشی غلامی کے اثبات میں بے شمار آیات پیش کی جا سکتی ہیں ، لیکن سر دست ہم مندرجہ بالا آیات ہی پر اکتفا کرتے ہیں ۔ بلا شک '' فساد فی الارض '' اپنے معنی و مفہوم میں عام ہے لیکن اس کی قبیح ترین صورت ماضی اور موجودہ دور میں بے کاری ، محرومی اور معاشی غلامی ہی ہے ۔ لہذا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ، سورۃ المائدہ کی محولہ بالا آیت میں بے کاری اور محرومی کا مسئلہ پیدا کرنے والوں کو پوری انسانیت کا قاتل قرار دیا گیا ہے ۔

خود سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۳۲ کا آخری حصہ اس مسئلہ کی وضاحت میں سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاً (۵ : ۳۲)۔ (اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا اس نے تمام انسانوں کو) اس آیت سے عام طور پر انسانی جان کو قتل و غارت سے محفوظ رکھنا مراد لی جاتی ہے، لیکن ہمارے خیال میں قرآن حکیم کی وسیع تعلیمات کو یوں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس آیت سے مراد ہر طرح سے انسانی جان کا تحفظ ہے۔ قتل نفس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں، جن میں سے انسانوں کو معاشی طور پر بے کار اور محروم کر دینا بدترین صورت ہے، یقیناً قتل کر دینا شدید ظلم ہے لیکن کسی شخص کو معاشی طور پر بے کار اور تباہ حال کر دینا قتل سے زیادہ قبیح ظلم ہے کیونکہ ایسی صورت میں انسان کو اس طرح چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ نہ زندہ ہے نہ مردہ۔ اور موت و حیات کی یہ کشمکش یکطرفہ موت سے زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''و من احیاھا'' سے مراد نہ صرف انسانوں کو قتل و غارت گری سے محفوظ رکھنا ہے بلکہ انہیں معاشی و اقتصادی طور پر خود کفیل بنانا بھی ہے تاکہ وہ زندہ رہیں تو باعزت انسانوں کی طرح زندہ رہیں۔ قرآن حکیم کی اس آیت کا معنی یہ ہوا کہ جس نظام اور جس معاشرے نے اپنے ملک کے بے کار، بےروزگار اور محروم لوگوں کو زندہ رکھنے میں مدد دی اور ان کے لئے روزگار مہیا کئے اور انہیں معاشی و اقتصادی طور پر خود کفیل بنایا، تو گویا انہوں نے پوری انسانیت کو حیات بخش دی اور پوری انسانیت کو ہلاکت و تباہی سے بچا لیا (فکانما احیا الناس جمیعاً)۔ لہذا جو لوگ استحصال دولت کے ذریعے بے کاری، محرومی اور معاشی غلامی پیدا کرتے ہیں وہ قرآنی حکم کے مطابق انسانیت کے قاتل قرار دیئے جائیں گے اور جو نظام بے کاری اور محرومی دور کرکے سائلین و محرومین

کے لئے روز گار مہیا کرتا ہے وہ تمام انسانیت کو زندہ رکھنے کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے۔

مسئلہ بے کاری کو عموماً شہری سطح پر حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ، شاید اس لئے کہ روزگار دینے والے شہروں میں ہوتے ہیں یا پھر اس لئے کہ شہر میں بے کاری کا شکار ہو جانے والے منہ میں زبان رکھتے ہیں ، ان کی آواز اخبارات ، اجتماعات ، تقاریر وغیرہ کے ذریعے کہیں نہ کہیں سنائی دے جاتی ہے ، بڑے بڑے ادیب و مصنف ان میں رہتے اور ان کے مسائل پر کتابیں لکھتے ہیں لیکن بے کاری کے مسئلہ میں یہ مسلمہ حقیقت فراموش کر دی جاتی ہے کہ ہمارے ملک کی اسی فی صد سے زیادہ آبادی دیہات میں رہتی ہے جو اپنی بے بسی ، لاچاری ، جہالت ، اور شہروں سے دوری کے سبب ، اپنے مسائل و حالات کی تفصیلات نہ اخبارات میں دے سکتی ہے ، نہ اجتماعات میں بیان کر سکتی ہے نہ ہی ادباء و مصنفین کو ان کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہوتی ہے نہ ریڈیو اور ٹیلیویژن ان کے حال زار پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس وسیع و عریض ملک کے کروڑوں عوام ، شب و روز بھوک و افلاس کی کلفتیں سہہ سہہ کر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد یہاں سے چل بستے ہیں۔ لہٰذا مسئلہ بے کاری کے حل کے ذرائع و وسائل میں بھی ترجیحی بنیادوں پر کام کرنا ضروری ہوگا ۔

اس کے لئے لازمی ہے کہ بے کاری کے مسئلے کو اوپر سے نیچے کی طرف حل کرنے کی بجائے نیچے سے اوپر کی طرف حل کیا جائے۔ اس کی ابتدا دیہات سے ہو اور مسلسل قصبات سے شہر کی طرف حل ہوتا چلا جائے۔ اس سلسلے میں موجودہ نظام صنعت کے باعث بڑی دقت کا سامنا ہوگا کیونکہ روز گار کے یہ صنعتی ذرائع عام طور پر شہروں میں پائے جاتے ہیں، لیکن ہمارے خیال

میں شہروں کو ذرائع روزگار کا مرکز بنانا بذات خود مسئلے میں مزید پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ اس لئے کہ صنعتی مرکزوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے لئے صنعت کار اور کار خانہ دار دیہاتی مزدور پر انحصار کرتا ہے جس کی وجہ سے لاتعداد دیہاتی اپنے گھر، ماحول، رشتہ دار اور بیوی بچے چھوڑ کر شہر کا رخ کرتے ہیں، وہاں اگرچہ انہیں "قوت لایموت" تو مل جاتا ہے، لیکن اس انتقال سے بہت سے ایسے جدید مسائل جنم لیتے ہیں جو سابقہ مشکلات سے بھی بدتر ہوتے ہیں اس لئے خام مال اور مزدوروں کی فراہمی کے مرکز یعنی دیہات کو چھوڑ کر شہر کو ذرائع روزگار کا مرکز بنانا مسئلہ بے کاری کو مزید الجھانا ہے۔

اس سلسلے میں ہماری تجویز یہ ہے کہ ذرائع روزگار خود دیہات میں پیدا کئے جائیں۔ دیہات کے بےروزگار مزدوروں کے لئے شہری زندگی کی نئی نئی مشکلات پیدا کئے بغیر انہیں دیہات ہی میں روزگار مہیا کیا جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کام انتہائی مشکل نیا اور بے مثال ہے، لیکن مسئلہ بے کاری کا اس سے بہتر، مناسب اور قابل عمل کوئی دوسرا حل نہیں۔ اس تجویز کو پیش کرنے میں ہماری رہنمائی سنت رسول ص اور عمل خلفاء راشدین سے ہوئی۔ زکواۃ کی وصولی کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے سرور کائنات صلعم کا ارشاد گرامی ہے: "توخذ من اغنیائهم فترد علی فقرائهم"[۱] زکواۃ خوشحال مسلمانوں سے لے کر ان کے محتاجوں اور تنگدستوں میں لوٹا دی جائے۔ علماء و فقہاء امت نے پہلے "هم" کی ضمیر سے مراد وہ تونگر لئے ہیں جن سے ایک خاص علاقے میں زکواۃ وصول کی جائے اور دوسرے "هم" سے وہ محتاج و بے کار لوگ مراد لئے جو اس خاص علاقے میں پائے جائیں۔ ہمارے خیال میں "هم" کی یہ شرح خود عمل رسول صلعم اور خلفاء راشدین کے طرز عمل پر مبنی ہے۔

ابن سید الناس[۲] نے ایسے بہت سے عرب قبائل کا ذکر کیا ہے جو نظام

زکواۃ کے اس طریق پر جمع و خرچ کئے جانے کی وجہ سے عہد رسالت ص میں ہی خوشحال ہو گئے تھے - ابن سید الناس نے اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ آنحضرت صلعم ہر قبیلے میں اپنا ایک عامل مقرر فرما دیتے جو ہر قبیلے کے محتاجوں کی ایک فہرست تیار کرتا اور انہیں زکواۃ کے فنڈ سے اتنا دیتا کہ وہ بتدریج آسودہ و خوش حال ہونے لگتے ، اور تھوڑے ہی عرصہ میں مستقل ذرائع معاش حاصل کر لیتے - آنحضرت صلعم نے تقسیم زکواۃ کا یہ طریقہ بالکل آخری ایام میں اپنایا عرب قبائل آسودگی اور خوش حالی سے ہمکنار ہونے لگے تھے ، ہو سکتا ہے کہ نظام زکواۃ کی وجہ سے فقر و احتیاج کو دور کرنے میں انتہائی قلیل عرصے میں جو زبردست کامیابی نصیب ہوئی ، اسی وجہ سے عرب قبائل نے اپنی زکواۃ کا وہ قلیل حصہ بھی جو وہ اپنی مقامی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد مرکز کو بھیجتے تھے نہ بھیجنے پر اکسایا ہو - لیکن وہ بھول گئے کہ جس مرکز نے انہیں اتنی بڑی نعمت سے نوازا تھا اس کے ساتھ منسلک رہنے سے انہیں اور کتنے بڑے فائدے حاصل ہو سکتے تھے بلکہ وہ یقیناً بعد میں حاصل بھی ہوئے - آنحضرت صلعم کے اس طریق کار کو خلفاء راشدین نے بڑی کامیابی کے ساتھ پوری خلافت میں نافذ کیا اور قلیل ترین مدت میں اس کے جو انتہائی مفید اور کامیاب نتائج برآمد ہوئے تاریخ میں وہ اپنی مثال آپ ہیں -

فتح یمن کے بعد تقریباً ۹ ھ میں رسول اللہ صلعم نے حضرت معاذ بن جبل کو وہاں کا گورنر مقرر فرمایا ، حضرت ابوبکر رض و عمر رض نے بھی انہیں وہاں مسلسل بحال رکھا - حضرت معاذ رض نے رسول اللہ صلعم کی ہدایات کے مطابق نظام زکواۃ کو یمن میں نافذ کیا اس کے جو نتائج برآمد ہوئے ہم مختصراً انہیں یہاں بیان کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ مسائل کو مسائل کی جگہ پر حل کرنا کتنا آسان اور نتیجہ خیز ہوتا ہے - حضرت معاذ رض کو

تقریباً ۹ ھ میں یمن کا گورنر مقرر کیا گیا تھا ۔ اس طرح انہیں حضرت عمر رض کے عہد تک تقریباً چار سال کا عرصہ ملا ۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان چار سالوں میں نظام زکواۃ کے نفاذ کے کیا نتائج برآمد ہوئے ۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت معاذ رض نے حضرت عمر رض کے عہد خلافت کا پہلا سال ختم ہونے پر اپنے علاقے سے جمع شدہ کل زکواۃ کا تہائی حصہ مرکزی حکومت مدینہ کو بھیج دیا ۔ اس پر حضرت عمر رض جو حقوق و فرائض کے سلسلے میں انتہا درجے کے محتاط انسان تھے ، حضرت معاذ رض سے یوں گویا ہوئے :- میں نے تمہیں مال جمع کرنے یا جزیہ وصول کرنے کے لئے وہاں نہیں بھیجا بلکہ تمہیں اس بات پر مامور کیا ہے کہ وہاں کے صاحب نصاب لوگوں سے زکواۃ وصول کرکے وہاں کے محتاجوں کا فقر و احتیاج ختم کرنے پر صرف کر دو ، اس پر حضرت معاذ رض نے وضاحت کرتے ہوئے کہا : میں نے جو کچھ آپ کے پاس بھیجا ہے ، وہ مقامی ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے بعد بچ رہا تھا ۔ اور یہاں اب اسے وصول کرنے والا کوئی محتاج نہیں رہا ۔

دوسرے سال کے اختتام پر حضرت معاذ رض نے یمن کی کل زکواۃ کا نصف حصہ بھیج دیا ، جس پر حضرت عمر رض نے پھر ان سے وضاحت طلب کی اور حضرت معاذ رض نے پھر وہی پہلا سا جواب دیا ۔ تیسرے سال حضرت معاذ رض نے زکواۃ میں وصول ہونے والی تمام آمدنی حضرت عمر رض کے پاس مرکز کو بھجوا دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہلوا بھیجا کہ ''اب یہاں مجھے ایک بھی ایسا شخص نہیں ملا جو اس زکواۃ کے مال کو لینے کا محتاج و مستحق ہو۳ ۔'' اب اندازہ کیجئے کہ تقریباً سات سال کے قلیل عرصے میں مقامی آبادی میں نظام زکواۃ نافذ کرنے سے کیا نتائج برآمد ہوئے ، اور اس نظام کی خوبیوں اور فائدوں میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب اس بات پر غور کیا جائے کہ یہ سب کچھ اس دور میں ممکن ہو سکا ، جبکہ نہ عصر حاضر کی وسیع پیمانے پر صنعت کا

کوئی تصور تھا نہ زراعت و تجارت کی موجودہ سہولتیں میسر تھیں - حضرت معاذ رض کے واقعہ سے کہیں یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے کہ یہ واقعہ ان حالات میں منفرد حیثیت رکھتا ہے، ایسا نہیں بلکہ حضرت عمر رض کی خلافت میں ہر صوبے کا یہی حال تھا اور حضرت عمر رض ہر عامل سے اسی احتیاط و سختی کے ساتھ دریافت فرماتے کہ کہیں انہوں نے ظلم و زیادتی سے صرف میری خوشنودی کے لئے زکواۃ کی اتنی زائد رقم تو نہیں بچا لی ، تاریخ کی کتب اس بات کی شاھد ھیں کہ بحرین ، مصر ، شام ، عراق ، فلسطین وغیرہ تمام صوبوں سے زکواۃ و فۓ کی رقوم اتنی بڑی اور بھاری تعداد میں مرکز کو بھیجی جاتی تھیں کہ حضرت عمر رض انہیں دیکھ کر پریشان ھو جاتے تھے یہ صورت اس نظام کے مفید اور ھمہ گیر ھونے کا ثبوت ہے۔ اس نظام کی برکات کے نتیجے میں ھر علاقے کے لوگ قلیل ترین مدت میں خوشحال اور آسودہ ھو گئے تھے - زکواۃ کی انہیں خوبیوں اور اس کے انہیں عملی ، مؤثر و کارآمد نتائج کی روشنی میں ، ھم نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اس وقت بھی نظام زکواۃ کے قیام کی ابتدا ھر علاقے اور ھر قریہ سے ھو ، اور بےکاری اور بےروزگاری کے مسئلے کا حل اسی جگہ کیا جائے جہاں کا یہ مسئلہ ہے۔

اس کا طریق کار یہ ہے کہ ھر گاؤں اور ھر قصبے اور ھر شہر کی زکواۃ مقامی طور پر حکومت کی طرف سے وصول کی جائے اور اس خاص علاقے کے بےکار اور بےروزگار لوگوں کے لئے ذریعہ معاش مہیا کیا جائے - دیہات میں ذرائع معاش اور روزگار مہیا کرنے کا سب سے مؤثر اور قابل عمل طریقہ یہ ہے کہ وھاں کے مقامی زکواۃ فنڈ سے ایسی صنعت قائم کی جائے جس کے لئے خام مال وھاں کا علاقہ خود پیدا کرتا ھو - یہ صنعت یا کارخانہ وھاں کے مقامی محتاج و بےکار اور بےروزگار لوگوں کی ملکیت ھو ، جس میں وہ لوگ خود مزدور ھوں ، شروع میں اس صنعت کو چلانے کے لئے حکومت کی طرف سے ماھرین مقرر کئے

جائیں ۔ جو ایک طرف صنعت کو چلائیں اور ساتھ ہی ساتھ ان صنعت کاروں کو خود کفیل بننے کی تربیت دیں ، تاکہ کچھ عرصہ بعد یہ لوگ خود ماہرین و مزدور کا کام کر سکیں اور اپنی صنعت کو مہارت و کامیابی کے ساتھ چلا سکیں ۔

اس طریق کار سے یہ فوائد حاصل ہوں گے کہ تمام مزدور جو دراصل اس صنعت کے مالک ہوں گے ، انتہائی محنت و جانفشانی ، خلوص نیت و دیانتداری سے کام کر کے اپنی صنعت کی ترقی و خوش حالی کے لئے وہ کچھ کر دکھائیں گے جو کسی دوسری جگہ محض مزدوروں کی حیثیت سے توقع نہیں ۔

محنت و مزدوری کی خاطر ، دیہات کے بے کار اور بے روز گار لوگوں کو نقل مکانی کر کے شہروں میں جا کر آباد نہیں ہونا پڑے گا ، نیز نقل مکانی کے نتیجے میں جو بے شمار معاشرتی ، معاشی ، تمدنی اور دوسرے مسائل پیدا ہوتے ہیں ، اور جن کا حل مزدور کی حیثیت سے ایک دیہاتی کے لئے ناممکن ہے ، وہ پیدا نہیں ہوں گے ۔

دیہاتی مزدور اپنے آبائی مکان میں کرایہ کے بار سے نجات پا کر اطمینان کے ساتھ رہے گا ، جہاں تازہ ہوا ، کھلی فضا اور صحت بخش ماحول بھی نصیب ہوگا ۔ وہ ذرائع آمد و رفت ، بسوں ، گاڑیوں وغیرہ کے اخراجات سے بھی بچے گا ۔ دیہات میں رہ کر وہ سستے داموں ، نہایت عمدہ ، خالص اور سادہ ضروریات زندگی خرید سکے گا ، جو اس کی جسمانی صحت ، اور توانائی کے لئے مفید اور کار آمد ہوں گی ۔ شہر میں جا کر اپنی قلیل آمدنی سے وہ گراں ضروریات زندگی خریدے گا ۔ جو مضر صحت اجزا کی ملاوٹ کی وجہ سے اس کی صحت ، اور توانائی کو تباہ کر کے رکھ دیں گی اور وہ خود کسی مہلک مرض کا شکار ہو کر زندگی کا باقی

حصہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہ کر کسی وقت شہری زندگی کے نام پر دم توڑ دے گا۔

دیہات سے شہر میں منتقل ہونے پر جب اسے پہلی دفعہ نقدی ہاتھ آتی ہے تو اپنی جہالت، کم عقلی اور نا واقفیت کی بنا پر شہری زندگی کے اس پہلو کا شکار ہوجاتا ہے، جو اس زندگی کا انتہائی مہلک اور تباہ کن پہلو ہوتا ہے، وہ اپنی سادگی اور لاعلمی کی بنا پر اپنے ماں باپ، بیوی بچوں اور دوسرے لوا حقین کے حقوق نظر انداز کر کے اپنی قلیل ترین آمدنی مسلسل شہری زندگی کے اس قبیح ترین پہلو کی بھٹی میں جھونکتا رہتا ہے۔ اور لگاتار اسی ڈگر پر چلتے چلتے انتہائی قابل رحم حالت میں دم توڑ دیتا ہے، دیہات میں رہ کر جو پیسہ اسے حاصل ہوگا اسے وہ اپنی جائز ضروریات پر خرچ کر کے باقی ماندہ کو بچت میں ڈالتا جائے گا اور صنعت و حرفت سے واقف ہو جانے کی بنا پر زیادہ منافع بخش کاموں پر لگانے کی فکر کرے گا۔

اس طرح وہ مسائل جو دیہات کے شہروں میں منتقل ہونے کی وجہ سے مغربی صنعتی طریق کار کا لازمی جزو بن چکے ھیں بالکل ختم یا کم ہوجائیں گے۔ جن مشرقی ممالک نے مغربی صنعتی طریق کار کو اپنایا انھوں نے اسے مکمل طور پر اپنانے کی تقلید کرتے ہوئے مغربی ممالک کے وہ مسائل بھی اپنا لئے جنھیں مغربی صنعتی زندگی کے تجربہ سے بآسانی دور کیا جا سکتا تھا بشرطیکہ وہ اپنی منصوبہ بندی میں ھمارے طریق کار کو ملحوظ رکھتے، ایسی صورت میں نہ شہروں میں ایک دم آبادی کا تناسب بڑھتا۔ نہ مکانات کی قلت پیدا ہوتی نہ ذرائع آمد و رفت میں اتنی پیچیدگی رونما ہوتی۔

نظام زکواۃ کے تحت قائم ہونے والی علاقائی صنعت کاری کا یہ طریق کار مزید فوائد بھی لائے گا، اس سے صنعت کسی ایک بڑے شہر یا چند بڑے

شہروں میں مرتکز ہونے کی بجائے پورے ملک کے دیہات و قصبات میں پھیل جائے گی۔ صنعت کے اس پھیلاؤ سے قدرتی طور پر نقل و حمل کے لئے ذرائع آمد و رفت کی سہولتوں کا انتظام ہوگا۔ ہر علاقے کے لوگ اپنے اپنے علاقے میں پختہ سڑکیں، اور پل وغیرہ بنانے کی طرف توجہ دیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پورے ملک میں سڑکوں، ریلوں اور دوسرے ذرائع آمد و رفت کا نظام ترقی کرے گا اور لوگ بآسانی ملک کے مختلف حصوں میں آجا سکیں گے، جس سے ملک کے باشندوں میں قومیت کا جذبہ فروغ پائے گا۔ علاقائی عصبیت کم ہوگی اور مختلف علاقوں کے لوگ قومی نقطۂ نظر سے سوچنے کی طرف مائل ہوں گے۔ ہمارے خیال میں نظام زکواۃ کے اس طریق کار پر باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت عمل کیا جائے تو دو، پانچ پانچ سالہ منصوبہ بندیوں میں ہم ملک سے بیکاری ختم کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

حواشی

۱ - حافظ ابن حجر العسقلانی ، فتح الباری ۳ : ۲۳۱

۲ - ابن سید الناس ، عیون الاثر ۲ : ۲۳۶

۳ - ابو عبید ، کتاب الاموال ، حصہ دوم ص ۳۲۸

معاشی غلامی کا حل

مصارف زکواۃ کا دوسرا بڑا مصرف " و فی الرقاب " غلامی سے آزادی دلانا ہے۔ مفسرین نے اپنے دور اور اپنے معاشی حالات کے پیش نظر " و فی الرقاب " (غلامی سے آزادی دلانے) کی تفسیر میں بڑی وسعت پیدا کر دی ہے۔ ذیل میں مفسرین کی آراء کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے : ۔

۱ - غلاموں کو ان کے آقاؤں سے خرید کر ، آزاد کروانا ۔

۲ - مکاتبین (جن غلاموں نے اپنی آزادی کی قیمت ادا کرنے کا معاہدہ اپنے آقاؤں سے کر رکھا ہو ، ان) کی ادائیگی میں مدد کرنا ۔

۳ - ان مسلمان قیدیوں کو رہا کرانا جو دشمن کے قبضے میں ہوں ۱ ۔

اس سے معلوم ہوا ہے کہ فقہاء و مفسرین کے نزدیک " و فی الرقاب " سے مراد غلام ، مکاتب اور قیدی کی آزادی اور رہائی ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں " فی الرقاب " انسانی بنیادی حقوق و آزادی کے حصول میں حائل ہر قسم کی قید و بند اور ہر طرح کی غلامی ہے۔ اس خیال کی توضیح اگلے صفحات میں کی جائے گی ۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مفسرین نے اپنے معاشرتی و معاشی حالات کے مطابق " و فی الرقاب " کی وسعتوں کو معلوم کرنے کی کوششیں کیں۔

قرون اولیٰ کے معاشی حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و سلم قرآنی تعلیمات کے تحت

جو انقلاب لائے تھے ، معاشی نقطۂ نظر سے اس کا اثر یہ ہوا کہ جزیرہ عرب ، شام ، عراق ، ایران ، مصر ، شمالی افریقہ اور اندلس جیسے ممالک کے کروڑھا انسانوں کی کثیر آبادی ، ان ممالک کے مٹھی بھر سرمایہ داروں ، تاجروں ، جاگیرداروں اور شاھی درباریوں کی معاشی غلامی سے آزاد ھو کر باعزت اور خود مختار انسانوں کی صف میں شامل ھو گئی تھی - مورخین ، فقہاء اور مفسرین کی شہادت کے مطابق ھمہ گیر معاشی غلامی گھٹتے گھٹتے بالآخر ایک نہایت محدود طبقے - غلام ، مکاتب اور قیدی - میں سمٹ کر رہ گئی تھی - چونکہ اسلام کے نزدیک انسان جب تک معاشی ، سیاسی ، مذھبی ، فکری اور اسی قبیل کی دیگر غلامیوں سے آزاد ھو کر ، صرف اللہ وحدہ، لا شریک لہ، کی غلامی میں نہیں آجاتا ، نہ اس کی انسانیت تکمیل پاتی ھے اور نہ وہ پورے طور پر مسلمان ھو سکتا ھے - اس لئے قرآن حکیم نے اس سسکتی اور دم توڑتی ھوئی معاشی غلامی پر بھی کاری ضرب لگائی تاکہ دنیا سے معاشی غلامی کا پوری طرح استئصال ھو اور سب انسان آزاد ھو کر اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ھوئے انسانیت کی خدمت انجام دے سکیں ۔ اس پس منظر میں " و فی الرقاب " (غلامی سے آزادی دلانے) کی فرضیت کے حکم و اسرار الٰہی کا فلسفہ واضح ھوتا ھے اور یہ بات کھل کر سامنے آتی ھے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاشی غلامی اتنی ناپسندیدہ چیز ھے کہ وہ اسے شرک قرار دیتا ھے - جیسے عقائد میں شرک ناقابل معافی جرم ھے ویسے ھی انسانوں کو معاشی طور پر غلام بنانا ناقابل معافی جرم ھے - اور ایسے مجرمین کے خلاف جہاد کرنے کے لئے اسلامی حکومت پر یہ فرض عائد ھوا کہ وہ معاشی غلامی دور ھونے تک زکواۃ کا بجٹ مسلسل اسی پر خرچ کرتی رھے -

یہاں عرب و عجم پر مسلط ھمہ گیر معاشی غلامی (و فی الرقاب) کو سمیٹ کر ، غلام ، مکاتب اور قیدی تک محدود کر دینے والی زبردست قوت کا

مختصر بیان ضروری ہے۔ قرآن حکیم نے ”و فی الرقاب“ کے ذریعہ ہر قسم کی غلامی کے خلاف زبردست جہاد کی تلقین کی ہے اور تمام مسلمانوں کو بالعموم اور مسلمان حکومت کو بالخصوص اس بات کا حکم دیا ہے کہ وہ ہر قسم کی غلامی کا انسداد کرے اور جہاں کہیں اور جس زمانے میں بھی جس قسم کی غلامی موجود ہو، اس کا مکمل قلع قمع کرے۔ اس اعتبار سے ”و فی الرقاب“ ایک محدود قسم کی غلامی کا نام نہیں بلکہ یہ قیامت تک ہر قسم کی غلامی پر محیط ہے، جس میں اللہ کے آزاد بندوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہوں، اور مختلف قسم کے طوق غلامی ان کی عقلی، فکری، ذہنی اور جسمانی قوتوں کو مفلوج کر رہے ہوں۔ پھر غلامی چونکہ عامۃ الناس کی گردنیں بھی جکڑ سکتی ہے اور حکومتوں اور قوموں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے، اس لئے ”و فی الرقاب“ سے مراد محض ایک معاشرے کے عوام ہی کو آزادی دلانا مقصود نہیں بلکہ اگر کوئی مسلمان قوم یا پوری امت مسلمہ اس میں گرفتار ہو تو ان سب کو آزادی دلانا، اور ان کی مختلف قسم کی غلامی کے پھندوں کو کاٹنا اور ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے معاشی، سیاسی، فکری و مذہبی طوقوں سے نجات دلانا ”و فی الرقاب“ میں شامل ہے، چونکہ قرآن حکیم کے بتائے ہوئے نظام زکواۃ کا یہ مصرف انتہائی جامع ہے، اس لئے اس پر عمل، اور اس کے مفید و کارآمد نتائج کا حصول صرف اسی حالت میں ہو سکتا ہے جب کہ ”و فی الرقاب“ ہر قسم کی غلامی کے پیچ در پیچ طوق کاٹنے کے لئے اس انقلاب انگیز قوت متحرکہ کو پوری طرح سمجھ لیا جائے جو اس کی کامیابی کی ضامن اور اس کے مفید و کار آمد نتائج کی ذمہ دار ہے۔

ہمارے خیال میں اسلام، معاشی مسئلے کا جو حل بتاتا ہے وہ مادی معاشی حل سے مختلف ہے۔ اس لئے جب تک اس قوت کا بیان نہ کیا جائے اس وقت

تک اسلامی معاشی مسئلے کے حل کو مادی معاشی مسئلے کے حل سے جدا نہیں کیا جا سکتا ، نہ ہی اس انقلاب کا صحیح پس منظر معلوم ہو سکتا ہے جس نے چند سال کے اندر اتنی بڑی تبدیلی پیدا کر دی تھی جس کا اگر صحیح ادراک ہو جائے تو موجودہ معاشی انقلاب اپنے تمام جدید وسائل ، سائینسی اور تکنیکی سہولتوں کے باوجود اس انقلاب کے سامنے ماند پڑ جائے۔ گو بادی النظر میں قارئین کو یہ بیان شاید موضوع سے ہٹا ہوا معلوم ہو لیکن ہمارے خیال میں اس کا ذکر ناگزیر ہے۔

تاریخ عالم پر نگاہ رکھنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ جب عدل و انصاف پر مبنی کوئی نظام ٹوٹتا ہے تو سب سے پہلے معاشی بےانصافی اور اقتصادی استحصال کے ذریعے ''اہل ثروت'' کا طبقہ معرض وجود میں آتا ہے۔ عربوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سابق ابنیاء علیہم السلام کی تعلیمات پر مبنی معاشرے میں جب فساد پیدا ہوا تو ان میں معاشی بےانصافی اور لوٹ کھسوٹ کے ذریعے ''اہل ثروت'' کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا ، لیکن چونکہ سابقہ انبیاء کی تعلیمات کا احترام لوگوں کے دلوں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا اس لئے ایک دوسرے طبقے نے ان تعلیمات کو اپنا پیشہ بنا لیا اور اس طرح سابقہ ابنیاء کی تعلیمات جو سب کا مشترکہ ورثہ تھیں ، اس مخصوص طبقے کی اجارہ داری میں آگئیں ، اور ''اہل مذہب'' کا طبقہ معرض وجود میں آگیا ، لیکن چونکہ اس ''اہل مذہب'' کا اپنا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا اس لئے معاشی طور پر یہ لوگ ''اہل ثروت'' کے دست نگر ہوگئے ، ان دو طبقوں کی موجودگی میں ''اہل حکومت'' کا جو طبقہ بھی معرض وجود میں آتا وہ یقیناً ان دو بازوؤں یعنی ''اہل ثروت'' اور ''اہل مذہب'' کے زور پر ہی قائم رہ سکتا تھا ، چنانچہ ایسا ہی ہوا ، چونکہ ''اہل حکومت'' کا یہ طبقہ عوام کی مرضی اور ان کی منشاء اور ارادے

کے خلاف '' دولت و فتویٰ '' کے زور پر قائم ہوا تھا ، اس لئے '' اہل حکومت '' کے لئے لازبی تھا کہ وہ عوام کو '' اہل ثروت '' اور '' اہل مذہب '' کا تابع بنائیں۔ اس طرح '' اہل ثروت '' '' اہل مذہب '' اور '' اہل حکومت '' نے باہمی اشتراک سے ، ظلم و استبداد اور معاشی بے انصافی کو عوام پر مسلط کر رکھا تھا اور ایک اقلیتی طبقے نے اللہ کے بے شمار بندوں کو اپنی معاشی غلامی (و فی الرقاب) میں جکڑ رکھا تھا ۔ اس پس منظر میں ہم اس قوت قاہرہ کا بیان کریں گے جس نے ظلم و بے انصافی کی جگہ عدل و انصاف اور معاشی استحصال کی جگہ مودت و رحمت اور انسانی مساوات قائم کر دی ۔

اس انقلاب انگیز قوت متحرکہ سے ہماری مراد قرآن حکیم کی تعلیمات پر مبنی نظریۂ توحید اور انسانی مساوات ہے ۔ تاریخ عالم میں غلامی کی جملہ اقسام خصوصاً معاشی غلامی '' و فی الرقاب '' کے خلاف اسلام سے پہلے کوئی تحریک اتنی شدت و قوت کے ساتھ نہیں اٹھی تھی ۔ یہ قرآنی تعلیمات پر مبنی اسلام کا وہ زبردست انقلاب تھا ، جو ہر قسم کی غلامی کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا ، قبل از اسلام ایک عالمگیر فاسد معاشی نظام کی طرح ، مکہ ، مدینہ اور طائف ، حجاز کی تین بڑی آبادیوں پر اہل ثروت ، اہل مذہب اور اہل حکومت ۔ '' اقانیم ثلاثہ '' ۔ کے باہمی اشتراک سے اقلیتی طبقے نے اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر ، عوام پر ظلم و استبداد اور معاشی استحصال کے ذریعے قبضہ جما رکھا تھا ۔ قرآن حکیم کی تعلیمات کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس تثلیث میں '' باپ '' کا درجہ '' اہل ثروت '' کو ، ماں کا مقام '' اہل مذہب '' کو اور بیٹے کا مرتبہ '' اہل حکومت '' کو حاصل تھا ۔ اس تثلیث کا وجود اسی وقت ممکن ہو سکا جب عوام کو ان کے سیاسی ، معاشی اور دوسرے معاملات میں حق خود ارادی سے محروم کر دیا گیا تھا ۔

اس هیئت ترکیبی کا نتیجه یه هوا که ''ماں'' اور ''بیٹا'' (''اهل مذهب'' اور ''اهل حکومت'') فرمانبرداری کے تقاضے کے تحت ''باپ'' (اهل ثروت'') کے احکام بجا لانے اور اس کے اعمال و افعال کے لئے جواز پیدا کرنے کا کام بحسن و خوبی انجام دیتے تھے۔ توضیح کے لئے صفحه ۳۲ پر ڈایاگرام ملاحظه هو۔

انسانیت پر ظلم و جور جب اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور اکثریت کی گردنوں میں مختلف قسم کی غلامی کے طوق پڑ گئے، تو رب العالمین نے مظلوم انسانیت کو اس تثلیث کے پنجه سے چھڑانے کے لئے رحمة للعالمین کو مبعوث فرمایا۔ قرآن حکیم اور تاریخ اسلام کے اوراق اس بات پر شاهد هیں که نبی اکرم رحمة للعالمین ص کی دعوت و تبلیغ کا خطره سب سے پہلے ''اهل ثروت و سرمایه‌دار'' کو لاحق هوا، اهل ثروت چونکه عوام الناس کے معاشی استحصال کے ذریعے معرض وجود میں آئے تھے، اس لئے قرآنی تعلیمات، اور اسوۂ رسول مقبول صلعم اس معاشی بے انصافی اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف سراپا انقلاب تھے، چونکه ''اهل ثروت'' کی موت سے، ان کے حواریوں یعنی ''اهل مذهب'' اور ''اهل حکومت'' کی هلاکت بھی یقینی تھی، اس لئے وہ بھی اس معاشی نظام کے تحفظ و استحکام اور بقاء و دوام کے لئے اٹھ کھڑے هوئے، چنانچه اسلامی انقلاب کو روکنے اور اس کا مقابله کرنے کے لئے ''اهل ثروت'' جو عملاً همیشه سے بزدل تھے، پس پرده، ''اهل مذهب'' اور ''اهل حکومت'' کی مالی مدد کرنے لگے، اور یه دونوں طبقے ''اهل ثروت'' کے اشارے پر انقلاب محمدی ص کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ ''اهل مذهب''، اپنے فرائض منصبی کی رو سے، اس نظام کے مبنی برحق و انصاف هونے کے فتوے دینے لگے، اور اپنی تمام قوتیں اس بات کے ثبوت میں صرف کرنے لگے که معاشی بے انصافی اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کا یه نظام ان کے ''باپ دادا'' سے ایسے هی چلا آرها ہے اور ''باپ دادا''

کی طرف سے آنے والا ہر نظام ہمیشہ برحق ہوتا ہے : " واذا فعلوا فاحشة قالوا وجدنا علیها اٰبائنا واللہ امرنا بها " (۷ : ۲۸) اپنے فواحش و فساد پر مبنی کارناموں کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے ان کارناموں کا جواز یہ ہے کہ ہمارے آباء و اجداد ایسا ہی کرتے چلے آئے ہیں، مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بھی ہمیں ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے : " قل ان اللہ لا یأمر بالفحشاء اتقولون علی اللہ مالا تعلمون (۷ : ۲۸) اے رسول ص اب آپ ص انہیں یہ بتائیے کہ اللہ تعالیٰ تو ظلم و فساد و منکرات و فواحش کا ہر گز حکم نہیں دیتا ، کیا تم اللہ پر اس بات کا بہتان لگا رہے ہو، جس کا نہ تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے اور نہ تم اس بارے میں کوئی علم رکھتے ہو، لہذا جو کوئی " باپ دادا " کے قائم کردہ نظام کے خلاف آواز اٹھائے خواہ رب العالمین کی طرف سے رحمة للعالمین ہی کیوں نہ ہو، وہ لائق گردن زدنی ہے - ساتھ ہی "اہل مذہب" نے "اہل ثروت" کی شہ پر "اہل حکومت " کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس نئے داعی کے خلاف اپنی تمام قوتیں لگا دیں اور رائج الوقت معاشی نظام کے خلاف آواز اٹھانے والے کو بمع اس کے ساتھیوں کے صفحۂ ہستی سے مٹا دیں ، " اہل حکومت " جن کا اپنا وجود عوام کی تائید و حمایت کی بجائے ، خود " اہل ثروت " اور " اہل مذہب " کے اقلیتی اور محدود طبقے کی حمایت پر قائم تھا " دولت و فتویٰ " کی دوہری قوت کے ساتھ سرور عالم صلی اللہ علیہ و سلم کی شمع نبوت کو بجھانے کے لئے انتہائی شرمناک ہتھکنڈوں کے ساتھ میدان میں نکل آئے (یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواههم (۹ : ۳۲) چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنے مونہوں سے بجھا دیں -

نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے اس تثلیث کا مقابلہ دو عالمگیر اصولوں کی تبلیغ سے شروع کیا :-

۱ - اللہ تعالیٰ کی توحید

۲ - انسانی مساوات

خالق کائنات کے بارے میں جتنے باطل عقائد مروج تھے قرآن حکیم نے ان سب کی دھجیاں اڑا دیں ، اور دلائل و براھین سے ثابت کیا ، کہ اس کائنات کا خالق صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات و حدہٗ لا شریک لہٗ ہے :

هو الله الذی لا اله الا هو عالم الغیب و الشهادة هو الرحمان الرحیم هو الله الذی لا اله الا هو الملک القدوس السلام المؤمن المهیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان الله عما یشرکون هو الله الخالق الباریٔ المصور له الاسماء الحسنیٰ یسبح له ما فی السموات و الارض وهو العزیز الحکیم (٥٩ : ٢٢ تا ٢٤)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں سب چھپی اور کھلی باتوں کا جاننے والا وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے ۔ وہی اللہ ہے کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بادشاہ پاک ذات سلامتی دینے والا امن دینے والا ، نگہبان ، زبردست ، خرابی کا درست کرنے والا بڑی عظمت والا ہے ۔ اللہ اس سے پاک ہے جسے لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں ۔ وہی اللہ ہے پیدا کرنے والا ٹھیک ٹھیک بنانے والا ، صورت دینے والا ، اسی کے اچھے اچھے نام ہیں ۔ سب چیزیں اس کی تسبیح کرتی ہیں جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں اور وہی زبردست حکمت والا ہے ۔

ان آیات میں اثبات توحید کے ساتھ ساتھ رد شرک بھی کیا اور مشرکین کی اس کج فہمی اور باطل عقیدے : هؤلاء شفعاؤنا عند الله (١٠ : ١٨) اللہ کے ہاں یہ ہمارے سفارشی ہیں : اجعل الالهة الها واحداً ان هذا لشیٔ عجاب

(۳۸ : ۵) یہ تو عجیب بات ہے کہ اس نے ان سب خداؤں کا ایک خدا بنا دیا ، کی عقلی و علمی دلائل سے تردید کی اور ثابت کیا کہ اللہ ، خالق کائنات کی وحدانیت میں کوئی دوسری چیز شریک نہیں ہو سکتی ۔

اسی طرح رسول اللہ صلعم نے قرآن حکیم کی تعلیمات پر مبنی انسانی مساوات پر زور دیا اور باطل و فاسد معاشی نظام کی پیداوار ، انسانی طبقات کی دیواروں کو ریزہ ریزہ کر دیا ۔ جو لوگ مال و دولت ، حسب و نسب اور جغرافیائی عوامل کو وجہ عز و شرف خیال کرتے تھے ، ان کے مزعومات کا بطلان اس طرح کیا :

یا ایہا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منہا زوجہا وبث منہما رجالاً کثیراً و نساء (۴ : ۱)

لوگو ! تم اپنے اس پروردگار کے سامنے جواب دہی کے لئے تیار ہو جاؤ ، جس نے تمہیں نفس واحد سے پیدا کیا اور پھر اس نفس واحد سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور پھر ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا ۔ اور فرمایا :

یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی و جعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا (۴۹ : ۱۳)

اے بنی نوع انسان ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شعوب و قبائل میں اس لئے تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو

توحید باری تعالیٰ اور مساوات انسانی کے دو عالمگیر اصولوں کی تبلیغ سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ و سلم نے پوری دنیا کے نظام معاشرت میں تہلکہ مچا دیا ، اقوام و ملل کے معاشروں کی بنیاد اب اہل ثروت کے ایماء پر باطل

معبودوں ۔ بتوں ، زندہ یا مردہ انسانوں ، محرف مذاہب ، مال و دولت اور جاہ و حشمت کے بجائے اللہ وحدہ، لا شریک لہ، کی عبادت اور بندگی پر رکھی ۔ توحید باری کے عقیدے نے معاشی غلاموں اور پس ماندہ انسانوں کو جرأت دلائی کہ وہ اپنی انسانی حیثیت کو سمجھیں ، اپنے اعلیٰ و اشرف مقام انسانیت کا شعور حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر دنیا میں ظلم و جور پر مبنی ہر باطل قوت کا مقابلہ کریں ۔ توحید کے عقیدے نے مجبور و مقہور انسانوں میں ایسی جرأت و بے باکی پیدا کر دی کہ غلام اپنے آقاؤں کے ظلم و استبداد کا مقابلہ کرنے کی جرأت کرنے لگے ، وہ ان جھوٹے اور باطل عقائد نیز فاسد و فرسودہ رسم و رواج اور بے جا مذہبی پابندیوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ، جن کی وجہ سے وہ اہل ثروت کی بھٹی کا ایندھن بنے ہوئے تھے ۔ سرور کائنات صلعم نے قرآنی ہدایت کے مطابق: و یضع عنھم اصرھم و الاغلال التی کانت علیھم (۷ : ۱۰۷) رسول اکرم ص انسانوں پر لدے ہوئے (روایات و خرافات کے) بوجھ اتارتے ہیں اور ان باطل و فرسودہ بندھنوں کو کاٹتے ہیں جن میں انسانی عقل و فہم اور جسم و دماغ جکڑے ہوئے تھے ، اپنے ماننے والوں میں یہ روح پھونک دی کہ جہاں کہیں عقل و فکر پر پابندی ، جسم و دماغ پر قید اور سوچنے اور سمجھنے پر پہرہ لگانے والی قوت ہو اسے تباہ کر دو ، اور جو باطل و فرسودہ گروہ یا طبقہ خواہ وہ احبار و رہبان جیسے مذہبی اجارہ داروں کا ہی کیوں نہ ہو ، ان کو نیست و نابود کر دو : ان کثیراً من الاحبار و الرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل و یصدون عن سبیل اللہ (۹ : ۳۴)

قرآنی تعلیمات اور سنت رسول اکرم رض پر مبنی اس عقیدہ توحید کا اثر یہ ہوا کہ صحابہ کرام رض اگرچہ ایک قلیل تعداد میں اس پیغام کو لے کر اٹھے تھے لیکن حق کی قوت اور توحید سے سرشاری نے اس ''فئۃ قلیلۃ'' (چھوٹی سی پارٹی)

کو باطل اور اوہام و ظلم پر قائم رہنے والی " فئۃ کثیرۃ " (بڑی پارٹی) پر غالب کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس باطل نظام کے ایوانوں میں تہلکہ مچ گیا ، جو معاشی استحصال اور اقتصادی بے انصافی پر قائم ہوا تھا اور یہ سیل بے پناہ فرسودہ نظام کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لئے گیا ، اس کے جواز کا فتویٰ دینے والے یا تو بخلوص نیت تائب ہو کر اہل حق کی صف میں شامل ہوتے چلے گئے یا پھر اس معرکہ حق و باطل میں ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد ہوگئے۔

حقیقۃً عقیدہ توحید وہ عظیم قوت ہے جس کی تاب مقاومت نہ شرک کی قدیم قوتیں لا سکتی ہیں، نہ جدید میزائل اور نکلیئر اسلحہ کی مورچہ بندیاں۔ معاشی عدل و انصاف قائم کرنے والے اہل حق کے سامنے معاشی استحصال اور لوٹ کھسوٹ سے بننے والے اہل ثروت کسی صورت نہیں ٹھہر سکتے " این ما تکونوا یدرککم الموت و لو کنتم فی بروج مشیدۃ (۴ : ۷۸) تم جہاں کہیں بھی ہوگے تباہی سے بچ نہیں سکتے۔ خواہ تم اپنی حفاظت کے لئے مضبوط قلعوں میں ہی کیوں نہ ہو ،

بگاڑ چاہے سیاست میں ہو یا معیشت میں ، معاشرت میں ہو یا مذہب میں ، اس کی اصلاح صرف عقیدہ توحید کی قوت سے ہو سکتی ہے۔ جو ہمیشہ باطل قوتوں سے ٹکرانے اور انہیں پاش پاش کرنے کے لئے بےچین رہتی ہے حتیٰ کہ باطل تباہ ہو کر حق کے لئے میدان خالی کر دے۔ اہل توحید کی تعریف میں حق تعالیٰ نے فرمایا : ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ ، یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون و یقتلون (۹ : ۱۱۱) بے شک اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں کہ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں ۔

نور توحید ، چشمہ عدل و انصاف ، کی لازوال قوت کے بارے میں ، قرآن حکیم نے فرمایا : '' یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم و یأبی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون ۔ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون '' (۹ : ۳۲ - ۳۳)

وہ چاھتے ھیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنے سونھوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کئے بغیر نہیں رھے گا خواہ کافر ناپسند ھی کریں ۔ اس نے اپنے رسول کو ھدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ھے تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے خواہ مشرک نا پسند کریں ۔

عقیدہ توحید اور انسانی مساوات کی تعلیمات نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی قیادت میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین کو وہ بے پایان اور لاتناھی قوت جہاد عطا فرمائی کہ وہ عدل و انصاف کی راہ میں حائل ھر باطل قوت کو صفحۂ ھستی سے نیست و نابود کرنے کے لئے مسلسل جہاد میں لگ گئے ۔ توحید باری تعالیٰ اور مساوات انسانی کی راہ میں جو رکاوٹ اور مشکل پیش آئی انھوں نے اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا ، راہ خدا میں مجاھدین کی اس صف شکن مٹھی بھر جماعت '' فئۃ قلیلۃ '' نے ظلم و استبداد کی ھر قوت کو روند ڈالا ، راستے کی ھر مشکل خواہ افقی تھی یا عمودی (Horizontal or Vertical) توحید و مساوات کی بے پناہ قوت سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ھوگئی : و قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین للہ (۲ : ۱۹۳) مخالف قوتوں سے لڑتے رھو حتی کہ ان کی فتنہ و فساد پیدا کرنے والی قوت تباہ و برباد ھو جائے اور دین اللہ کا ھو جائے ۔ مخالف قوت اگر عقیدہ توحید میں مداخلت کر رھی تھی تو اسے تباہ کر دیا اور اگر وہ مساوات انسانی کی راہ میں طبقاتی قوت کی حیثیت سے حائل تھی تو اس کا قلع قمع کر دیا ، نتیجۃً توحید و مساوات

کے علمبردار مؤمنین جب آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے تھے تو رب العالمین کے سوا انہیں کوئی معبود نظر نہیں آتا تھا اور اسی طرح جب وہ زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف نگاہ دوڑاتے تھے تو انسانیت کو طبقات میں تقسیم کرنے والی قوتیں مٹی ہوئی نظر آتی تھیں اور ہر طرف مساوات انسانی کی حکمرانی کا تسلط دکھائی دیتا تھا۔

حق و صداقت اور عادلانہ معاشی نظام کے قیام کی راہ میں "تثلیث" کے اجزائے ترکیبی — اہل ثروت، اہل مذہب اور اہل حکومت — ہی سب سے بڑی حائل قوت تھے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اہل ثروت کی سرمایہ پرست ذہنیت کے خلاف بھر پور حملے کئے، فرمایا: و الذین یکنزون الذھب و الفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم فتکویٰ بھا جباھھم و جنوبھم و ظھورھم، ھذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون (۹ : ۳۴، ۳۵) اور جو لوگ سونا اور چاندی (مال و دولت و جائداد) جمع کرتے ھیں۔ اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں درد ناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجئے، جس دن وہ دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی، یہ وہی ھے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، تو جسے تم جمع کرتے رھتے تھے اس کا مزہ چکھو۔

"اہل مذھب" دراصل "اہل ثروت" کے ھاتھ میں کٹھ پتلی تھے، اور وہ حق و صداقت اور عدل و انصاف کے عملاً قیام کے بجائے سرمایہ داروں اور اہل ثروت کی لوٹ کھسوٹ اور معاشی استحصال کے لئے اللہ کی آیات سے باطل کے جواز کے فتوے دیا کرتے تھے: یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ (۲ : ۷۹) جواز کا فتویٰ تو اپنے ھاتھ سے لکھتے ھیں، لیکن

انتہائی دیدہ دلیری اور جرأت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اللہ کی منشاء بھی یہی ہے۔ قرآن نے بتایا کہ بزعم خود یہ جنت کے ٹھیکیدار بنتے ، اور آیات الٰہی سے اس کا ثبوت بھی لاتے ہیں ، لیکن یہ محض ان کے من گھڑت ڈھکوسلے ہیں : و قالوا لن یدخل الجنة الا من کان هوداً او نصاریٰ تلك امانیهم قل هاتوا برهانکم ان کنتم صادقین (۲ : ۱۱۱) اور کہتے ہیں کہ سوائے یہود یا نصاریٰ کے (یہ اس وقت کے " اہل مذہب " تھے) اور کوئی جنت میں ہرگز نہیں جائے گا ۔ یہ محض ان کے ڈھکوسلے ہیں ، آپ انہیں چیلنج کیجئے کہ اگر تمہارے پاس اپنے فتوؤں کے جواز کی کوئی دلیل ہے تو اسے پیش کرو ۔

قرآن حکیم نے بتایا کہ " اہل مذہب " جب ایک طبقہ بن جاتے ہیں ، تو نہ صرف وہ اپنی خواہشات ، اورذہنی اختراعات کو عین دین قرار دینے لگتے ہیں ، بلکہ اہل حق کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائیں ۔ ان کی ہٹ دھرمی اور باطل پرستی اتنی شدید ہوتی ہے کہ وہ نبیؐ آخر الزماں کو بھی اپنی اتباع کرتے دیکھنا پسند کرتے ہیں : و لن ترضیٰ عنك الیهود ولا النصاریٰ حتی تتبع ملتهم (۲ : ۱۲۰) : اخلاقی طور پر یہ بدترین طبقہ ، اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے اللہ اور مذہب کو آڑ بناتا ہے ۔ اسے نہ اپنے ملک و مذہب کی فکر ہوتی ہے نہ اپنی معاشرت و سیاست وغیرہ سے کوئی دلچسپی ۔ اہل حق اور عوام کی جان جوکھوں میں ڈال کر دشمنوں کے لئے جاسوسی کرنا اور جھوٹ کو فروغ دینا بھی ان کا وتیرہ ہے : سمعون للکذب (۵ : ۴۲) اور یہ سب کچھ صرف اس لئے کہ وہ حرام کھا سکیں : اکلون للسحت (۵ : ۴۲) ۔ چونکہ اس طبقہ کا اپنا کوئی ذریعہ معاش نہیں اور وہ معاشی استحصال کرنے والے سرمایہ داروں کا آلۂ کار بن کر ہی اپنا وجود قائم رکھ سکتا ہے ، لہذا اس کی آمدنی سرمایہ دار کی لوٹ کھسوٹ کا ایک حصہ ہوتی ہے ۔

قرآن حکیم نے اہل ایمان کو اس طبقہ کی رہبانیت و احباریت سے دھوکہ نہ کھانے کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا : یاایھا الذین آمنوا ان کثیراً من الاحبار و الرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل و یصدون عن سبیل اللہ ، و الذین یکنزون الذھب و الفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم (۹ : ۳۴)

اے ایمان والو ! بہت سے علماء و مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں ، اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں درد ناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجئے ۔

اس آیت میں '' اہل مذہب '' کو اس زمانہ کی اصطلاح کے مطابق احبار و رہبان کے الفاظ سے یاد کیا تاکہ لوگ ان کے ناموں اور ظاہری شکل و صورت کے فریب میں مبتلا نہ ہوں ، جن کے باعث یہ طبقہ عوام کا مال ہڑپ کر جاتا ہے ۔

اللہ تبارک و تعالیٰ اس طبقہ کو اپنی کتاب اور اس کی مبنی بر عدل و انصاف تعلیمات یاد دلا کر تنبیہ کرتا ہے : ولا تکونوا اول کافر بہ ولا تشتروا بآیاتی ثمناً قلیلاً و ایای فاتقون و لا تلبسوا الحق بالباطل و تکتموا الحق و انتم تعلمون (۲ : ۴۱ ، ۴۲) اور تم ہی سب سے پہلے حق و انصاف کے منکر نہ بنو ، اور میری آیتوں کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچو ، اور مجھ ہی سے ڈرو ، اور سچ میں جھوٹ نہ ملاؤ ، اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ ۔

'' تثلیث '' کے تیسرے رکن ''اہل حکومت'' نے ، '' اہل مذہب '' کے فتوؤں کی آڑ میں حق و انصاف برپا کرنے والے انقلاب کا راستہ روکنے کی پوری کوشش کی ۔ قرآن حکیم نے ماضی کے اہل حکومت طبقہ کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا جو دراصل خود سرور کائناتؐ کے زمانے کے اہل

حکومت کی ذہنیت کی سچی تصویر تھا - جب توحید باری تعالیٰ کے بیان و تبلیغ سے اہل مذہب کے باطل معبودوں پر چوٹ پڑی، جس کا مطلب دراصل اہل ثروت اور اہل مذہب دونوں کے ذریعۂ معاش کی تباہی تھا ، تو اہل مذہب نے فتویٰ دیا کہ توحید الٰہی اور مساوات انسانی کا پرچار کرنے والے کی سزا موت ہے - اہل مذہب کے اس فتویٰ پر اہل حکومت فوراً حرکت میں آئے اور: قالوا حرقوہ و انصروا الھتکم ان کنتم فاعلین (۲۱ : ۶۸) اس مبلغ توحید و مساوات کو زندہ جلا دو ، اور اپنے (فاسد نظام کے نمائندہ) معبودوں کی مدد کرو -

قرآن حکیم نے ایک اور واقعہ بیان کیا ہے جس میں اہل حکومت نے '' اہل مذہب '' وغیرہ سے فتویٰ طلب کیا کہ کیا وہ حق و انصاف کی دعوت قبول کر لیں : قالت یا ایھا الملؤا افتونی فی أمری ما کنت قاطعۃً امراً حتی تشھدون (۲۷ : ۳۲) پوچھا ! اے معزز گروہ (اہل فتویٰ) مجھے میرے اس معاملے میں فتویٰ دو ، کیونکہ تمہارے فتوے کے بغیر میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتی - حق و انصاف کی دعوت کے مقابلے میں اہل فتویٰ کا متفقہ فتویٰ یہ تھا : نحن اولوا قوۃ و اولوا باس شدید (۲۷ : ۳۳) ہم تو بڑے طاقت ور اور زبردست ساز و سامان جنگ کے مالک ہیں ، یعنی عدل و انصاف کی دعوت کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمارے پاس سب کچھ ہے - اس قصے میں حاکم طبقہ کی نفسیات کا نہایت عمدہ تجزیہ کیا گیا ، ارشاد ہے : ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا و جعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ (۲۷ : ۳۴) ظالم حکمران جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فتنہ و فساد بپا کر دیتے ہیں ، وہاں کے معززین کو بے عزت کر دیتے ہیں ، یعنی جو اہل حکومت ، عوام کی مرضی و منشا کے بغیر حکومت پر قابض ہو جاتے ہیں ، ان کے نزدیک عزت و ذلت کا معیار محض ان کی حمایت اور ان کے مفادات کے ساتھ وفاداری کرنا قرار

پاتا ہے ۔ لہذا وہ لوگ جو اپنے بلند کردار کی وجہ سے معزز ہوتے ہیں ، ایسے اہل حکومت کے نزدیک ذلیل کہلاتے ہیں ۔ تاکہ اہل حکومت اپنی بداعمالیوں اور بدکرداریوں کا پردہ چاک نہ ہونے دیں ۔

قرآن حکیم کی رہنمائی اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و سلم کی قیادت میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے '' اہل ثروت '' ، '' اہل مذہب '' اور '' اہل حکومت '' کے خلاف عقلی ، علمی اور فہم و بصیرت پر مبنی ایسی پر زور تحریک چلائی کہ '' اقانیم ثلاثہ '' کے پاؤں اکھڑ گئے ، وہ عقلی و عملی طور پر لاجواب ، اور فہم و ادراک سے عاری ہو کر شمشیر و سنان تھامے اہل حق کے خلاف معرکہ آرا ہو گئے ۔ مومنین صادقین بھی ان کے مقابلہ میں تلوار کا مقابلہ تلوار سے کرنے کے لئے معرکہ حق و باطل میں ڈٹ گئے اور اس وقت تک ان کی تلواریں نیاموں میں نہیں گئیں جب تک کہ اس وقت کی متمدن دنیا سے '' تثلیث '' کا خاتمہ نہیں ہو گیا ۔ اس کامیاب انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ عموداً (Vertical) جزیرہ عرب ، عراق ، ایران ، شام ، فلسطین ، مصر ، شمالی افریقہ اور اندلس کی فضائے بسیط میں کعبۃ اللہ کے فرش سے لے کر رب العزت کے عرش تک صرف اللہ تعالیٰ ہی معبود نظر آتا تھا باقی تمام معبودان باطل صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے تھے ۔ اور افقی (Horizontal) طور پر مکہ کے دولت مند ، مغرور و متکبر خاندانوں سے لے کر عراق و ایران ، شام و مصر اور افریقہ و جنوبی یورپ تک کے تمام باطل ارباب — سرمایہ دار ، جاگیردار اور شاہی درباری — جو وہاں کے باشندوں پر اپنی پروردگاری کا سکہ چلاتے تھے ، تباہ ہو چکے تھے اور چین کی سرحدوں سے لے کر وسط فرانس تک لاکھوں میل کے وسیع و عریض رقبے میں مساوات انسانی کا پر کیف منظر آنکھوں کے سامنے جلوہ نما ہو جاتا تھا ۔ اس وسیع و عریض قطعہ ارضی کی معاشی سطح برابر نظر آتی تھی ۔ اور اگر کہیں کوئی تمیز

تھی بھی تو وہ بتدریج ہمواری میں تبدیل ہو رہی تھی۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ و سلم اس ''تثلیث'' کے خاتمے کے بعد ایک نیا معاشرتی و معاشی نظام معرض وجود میں لائے، اس نظام کی بنیاد مال و دولت، حسب و نسب اور جاہ و حشمت پر نہ تھی، بلکہ اس نظام کا بنیادی پتھر تھا کردار کی بلندی اور صالحیت و تقویٰ۔ قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں انسانوں کو سمجھا دیا تھا کہ پیدائشی طور پر تمام انسان برابر ہیں۔ مال و دولت اور حسب و نسب محض اتفاقات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ چیزیں باعث شرف نہیں: ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (۴۹ : ۱۳) اے انسانو! تم میں سب سے زیادہ معزز و محترم شخص اس الٰہی نظام میں وہ ہے جس کی سیرت و کردار میں تقویٰ سب سے زیادہ ہو۔

قرآن حکیم کے اس اعلان کے بعد مکہ و مدینہ اور طائف کی بستیوں میں ایک عظیم انقلاب بپا ہوگیا، وہ قوم جو آخری دم تک معاشی استحصال اور جمع مال کی دلدادہ تھی: الھکم التکاثر حتی زرتم المقابر (۱۰۲ : ۱، ۲)، اب اس کی حالت یہ ہے کہ جو کچھ گھروں میں موجود ہے، اسے بیکاری اور معاشی غلامی دور کرنے کے لئے خرچ کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں ہے ایک شخص گھر کی پوری جائداد کو رسی کے ذریعے دو برابر برابر حصوں میں بانٹ کر ان میں سے ایک حصہ اہل و عیال کے لئے رکھ لیتا ہے اور دوسرا حصہ سرور کائنات کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے، ایک اور شخص گھر کی پوری پونجی رسول اللہ ؐ کی خدمت اقدس میں لا ڈالتا ہے۔ ایک طرف وہ اہل حکومت تھے جو کروڑوں بندگان خدا کو معاشی غلام بنا کر ان کی جان و مال اور عزت و آبرو پر ڈاکے ڈالتے نہیں تھکتے تھے اور دوسری طرف یہ اہل حکومت کہ رات کو اس خوف سے نیند نہیں آتی تھی کہ شاید اللہ کا کوئی بندہ بھوکا

نہ رہ گیا ہو، ایک طرف وہ اہل حکومت جو انسانوں کو معاشی غلامی میں مبتلا کر کے ان کے خون پسینے کی کمائی خود ان سے اٹھوا کر اپنے خزانے بھرتے تھے، دوسری طرف یہ خدا ترس اہل حکومت جو اپنے کندھوں پر آٹے کی بوزیاں اٹھا کر بیواؤں کے گھروں میں لے جاتے تھے۔

صحابہ کرام رض عدل و انصاف پھیلانے میں اس درجے پر پہنچ چکے تھے جہاں ان کی راہ میں نہ ان کی جان اور عزت و آبرو حائل تھی نہ ان کی مال و دولت۔ انہوں نے اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کا سودا اللہ تبارک و تعالیٰ سے جنت کے عوض کر رکھا تھا: ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ . . . و ذلک ھو الفوز العظیم (۹ : ۱۱۱)

بےشک اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے اموال کا سودا جنت کے عوض کر لیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر قتل کرتے ہیں اور قتل ہو جاتے ہیں۔ یہ توریت اور انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے جس کا پورا کرنا اسے ضروری ہے اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے سو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے اس سے خوش رہو اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم پر لا تعداد درود و سلام جن کی بدولت قلیل مدت میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوگیا، کہاں مکہ کے یہ تاجر جو مال و دولت میں تکاثر کی خاطر سردیوں گرمیوں (رحلۃ الشتاء و الصیف) میں لق و دق صحراؤں سے طویل سفر کر کے شام و یمن کے تاجروں سے بیع و شراء کرتے تھے، اور کہاں یہ حالت کہ اب بیع و شراء کا معاملہ خداوند قدوس کے ساتھ کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ ایک وہ وقت کہ جمع و احتکار و تکاثر وظیفہ حیات، اور اب یہ صورت کہ حق کو عام کرنے کے لئے انفاق راحت جان اور فوز عظیم کا پیغام۔

غور کیجئے جب مومن بننے کے لئے شرط ہی یہ ہے کہ اپنی جان و مال اللہ پر ایمان لاتے ہی اپنی نہیں رہتی، تو پھر کیا مانع ہے کہ بندہ ان دونوں کے خرچ کرنے سے گریز کرے، قرآن حکیم کی اسی تعلیم نے عرب کے سرمایہ داروں کو یہ ہمت عطا فرمائی کہ انہوں نے جان سے زیادہ عزیز مال کو دنیا سے فقر و فاقہ دور کرنے کے لئے صرف کر دیا اور مسلسل غربت و افلاس کے خلاف جہاد کرتے چلے گئے - اگر کوئی طاقت ان کے جہاد کی راہ میں حائل ہوئی تو انہوں نے اس کے خلاف جانوں سے جہاد شروع کر دیا - چنانچہ جب تک میدان کار زار جاری رہتا ، وہ مسلسل پروانہ وار اپنی جانیں قربان کرتے رہتے حتیٰ کہ اہل باطل کو نیست و نابود کر دیتے ، اور اس جہاد بالنفس میں اپنی جان بچانا اللہ و رسول ص اور خود ان کے اپنے نزدیک کفر کی طرف پلٹنے کے مترادف تھا -

عوام کی ضروریات کو مقدم رکھنے کے اصول کا نتیجہ تھا کہ فاروق اعظم رض اپنی خلافت کے دوران مختلف صوبوں سے آنے والے اموال کو اس وقت تک ہاتھ نہیں لگاتے تھے، جب تک انہیں پختہ ثبوت نہ مل جاتا کہ یہ اموال وہاں کے مقامی لوگوں کی ضروریات پوری ہونے کے بعد بچ گئے ہیں - اسلام میں ذاتی ملکیت کا مسئلہ اضافی حیثیت رکھتا ہے - کیونکہ فقر و احتیاج اور غربت و افلاس اور معاشی غلامی وغیرہ کی موجودگی میں ملک و قوم کے کسی فرد یا جماعت کی کوئی ملکیت اس کی اپنی نہیں - عہد رسالت مآب میں اس اصول پر عمل اخلاقی طور پر ہوتا تھا - اور مومنین ''ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسہم و اموالہم'' پر بالفعل ایمان رکھتے تھے - چنانچہ سرور کائنات صلعم کو انسانی فلاح و بہبود کے لئے جب اور جس سے ضرورت پڑتی اسی وقت اس سے جتنا چاہتے حاصل کر لیتے تھے - صحابہ کرام رض صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی جان و مال کے امین تھے - اور اللہ کی راہ میں خرچ کا جب موقع آتا خرچ کرنے سے دریغ نہ

کرتے ۔ افسوس کہ بعد میں ، رسول صلعم کے زیر تربیت پیدا ہونے والا اخلاق کا یہ بلند معیار باقی نہ رہ سکا لہذا انہیں اخلاقی گرفت کے کمزور پڑ جانے کے باعث قانونی تعلیم بھی دی جانے لگی - یہی وجہ تھی کہ سرور کائنات صلعم کی وفات کے بعد جب بعض عربوں نے اخلاقی قوت کا انکار کیا تو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ، خلیفہ اول کو قانونی چارہ جوئی کی ضرورت محسوس ہوئی ۔

معاشی غلامی کا حل

قرآنی نقطۂ نظر سے جب تک معاشرے میں فقر و احتیاج اور معاشی غلامی موجود ہو ، مسلمانوں کا تمام مال و جائداد بیکاروں ، محتاجوں اور معاشی غلاموں کی حالت سدھارنے کے لئے وقف رہے گا: " فی اموالھم حق معلوم للسائل و المحروم " اگر معاشرے کے اہل ثروت اس اصول کو عہد رسالت مآب کی طرح اخلاقی ضابطہ کے طور پر اپنا لیں تو بہتر، ورنہ حکومت عمل صحابہ پر عمل کرتے ہوئے قانون کے ذریعے اس پر عمل کرائے گی - یہی فقہاء متقدمین و متاخرین کا فیصلہ بھی ہے - لیکن اس کے برخلاف آج جب کہ عوام فقر و احتیاج اوز غربت و افلاس کے پاٹوں کے درمیان پسے جا رہے ہیں ۔ " اہل فتویٰ " کا یہ فتویٰ کہ اسلام میں لا محدود ذاتی ملکیت و جائداد کی اجازت ہے ، انتہائی مضحکہ خیز و بے معنی ہے ، اس طرح تو ارشاد الہی کے خلاف دولت سمٹ کر چند خاندانوں میں رہ جائے گی ، امیر امیر تر اور غریب غریب تر بنتا چلا جائے گا ۔ ایسی صورت میں سرمایہ داری کے حق میں فتوے دنیا اہل حق کو زیب نہیں دیتا ۔

اسلام ہر قسم کی غلامی کو لعنت اور انسانیت کی محترم پیشانی پر بدنما دھبہ بتاتا ہے ۔ اور اسے تکمیل ایمان و انسانیت کے راستے میں حائل قرار دیتا ہے ۔ چنانچہ اس نے ہر قسم کی غلامی کے خلاف زبردست مہم چلائی اور واضح طور پر اعلان کیا کہ کسی انسان کو خواہ وہ انسان ، نبی ہی کیوں نہ ہو ، یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنی غلامی اور بندگی

پر مجبور کرے ۔ یہ حق صرف خدائے وحدہ، لا شریک لہ، اور خالق کائنات کا ہے کہ مخلوق اس کی غلامی اور بندگی میں آئے : ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب و الحکم و النبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین (۳ : ۷۹) کسی انسان کے لئے یہ مناسب نہیں کہ جب اللہ اسے کتاب، حکم اور نبوت عطا فرمائے تو وہ لوگوں کو اپنی غلامی اختیار کرنے کے لئے کہے، جو کہ اللہ کا حق ہے، بلکہ اسے کہنا یہ چاہئے کہ لوگ اللہ کی غلامی اور بندگی اختیار کریں ۔ اس آیت نے اشرف المخلوقات انسانوں میں سے افضل و برتر انسان یعنی نبی ص کو بھی یہ تنبیہ کی ہے کہ وہ انسانوں کو کسی قسم کی غلامی — سیاسی، معاشی و غیرہ — میں لینے سے باز رہے ۔ اور واضح الفاظ میں بتایا کہ جب کوئی فرد یا طبقہ دوسرے انسانوں کو معاشی یا سیاسی غلامی میں لے لیتا ہے، تو گویا وہ فرد یا طبقہ در اصل خالق کائنات کی جگہ لے کر حاکمیت و رازقیت کا مدعی اور خدائی کا دعویدار بن جاتا ہے ۔ اور قرآن کے نزدیک یہ شرک ہے جو ناقابل معافی جرم ہے ۔

انسانی مساوات اور معاشی غلامی سے آزادی دلانے کے لئے توحید کی تعلیم سے اسلام نے چند ھی سال میں ایک آزاد، متحرک و مجاھد، باھمت و جرأت مند، متفکر و متدبر معاشرہ کی تشکیل کی ۔ اور اس وقت کی غلامی کی بعض ناگزیر صورتوں کو بھی بتدریج ختم کرنے کی بناء ڈالی، الغرض اسلام نے معاشی حالات کو نئے سانچے میں ڈھال کر بد قسمت و محروم سعادت انسانوں کی آزادی و فلاح کے لئے جو زبردست مہم چلائی اسے ھم تین حصوں میں تقسیم کرتے ھیں :
(۱) مسلمانوں میں خدائی تعلیمات اور اسوہ رسول ص کے ذریعے یہ روح پھونکی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے نزدیک سب انسان برابر ھیں ۔ اس لئے خدا کی رضامندی اور منشاء یہی ہے کہ اس کے تمام بندے آزاد ھوں، اور چونکہ مسلمان باقی

انسانوں کی نسبت خدائی منشاء کے زیادہ سے زیادہ پورا کرنے والے ہیں، اس لئے ان کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ غلاموں، مکاتبوں اور اسیروں کی آزادی میں سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ قرآن حکیم کی اس روح کے تحت نیک دل مسلمانوں میں یہ جذبہ عام طور پر کار فرما ہوگیا کہ معاشی و سیاسی حالات کے تحت جو انسان ان کی غلامی میں آتا وہ اسے آزاد کر دیتے۔ ایسے بے شمار آزاد کردہ غلاموں نے تفسیر و حدیث، فقہ و تاریخ، اور علم و فلسفہ میں بڑا نام پیدا کیا۔

(۲) اسلام نے رضاکارانہ ذرائع اور ذیلی قوانین کے ذریعہ غلاموں کی آزادی کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کیں، مختلف قسم کے تاوان، متعدد گناہوں سے توبہ اور بعض حدود اللہ سے تجاوز سے کفارات اس کے شاہد ہیں۔ ذیل میں غلام آزاد کرنے کے حکم کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

مومن کے قتل خطا پر (۴ : ۹۲)

دشمن قوم کے مومن کے قتل پر (۴ : ۹۲)

معاہد قوم کے مومن کو قتل کرنے پر (۴ : ۹۲)

قسم توڑنے پر (۵ : ۸۹)

ظہار کرنے پر (۵۸ : ۳)

قرآن حکیم کے نزدیک عبادت اور نیکی کا معیار مشرق و مغرب کی طرف منہ کرکے محض نمازیں پڑھنا نہیں بلکہ اصل نیکی غلام و مجبور انسانوں کو آزادی دلانا ہے (۲ : ۱۷۷) ایک اور موقع پر فرمایا کہ انسان دشوارگزار گھاٹی میں گھسنے کا خطرہ کیوں مول نہیں لیتا؟ یعنی غلام آزاد کیوں نہیں کرتا اور بھوک دور کرنے کے لئے پیٹ بھرنے کا سامان کیوں فراہم نہیں

کرتا (۹۰ : ۱۳) گویا اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے معاشی غلاموں کو ان کا پیدائشی حق — آزادی — دلانا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

چنانچہ ان احکام کے بجا لانے پر غلاموں کی کثیر تعداد آزاد ہوگئی اور آئندہ غلامی کا سد باب کرنے کے لئے یہ طریق کار نہایت مؤثر و مفید ثابت ہوا۔

(۳) غلام، مکاتب اور اسیر کی آزادی کے لئے اسلام نے تیسرا سب سے بڑا قدم یہ اٹھایا کہ اس طبقے کی آزادی کے لئے اسلام کے اہم رکن زکواۃ — میں سے ایک بڑا حصہ اسی کام کے لئے وقف کر دیا۔ اور اسلامی حکومت پر یہ فرض عائد کیا کہ وہ سال زکواۃ میں سے غلاموں کی آزادی پر اتنا حصہ صرف کرے کہ غلامی کے پھندے میں پھنسے ہوئے انسان آزاد ہو جائیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں، زکواۃ کے اموال کو مذکورہ مصارف میں خرچ کرنا "فریضۃ من اللہ" ہے۔ لہذا حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ معاشی و سیاسی ہر قسم کی غلامی کے انسداد اور اس میں پھنسی ہوئی گردنوں کی آزادی کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔ چنانچہ "و فی الرقاب" غلاموں کو آزاد کروانا اسلامی حکومت پر بطور فرض عائد کر دیا گیا۔ اب اس حکم کی موجودگی میں پہلی دونوں صورتیں اگر سست پڑ بھی جائیں تو خدا کا مقرر کیا ہوا یہ قانون قیامت تک بطور فریضہ مسلمان حکومت پر عائد رہے گا کہ وہ غلاموں کی آزادی کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔

چنانچہ عقیدہ توحید اور نظریۂ انسانی مساوات اور مندرجہ بالا تین اقدامات کے ذریعے اسلام نے غلامی کی صدیوں پرانی لعنت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے اثر اور معطل کر کے رکھ دیا، اور صدیوں پرانے رواج اور سینکڑوں سال کی قدیم رسم کو بالکل بے جان اور مضمحل کر دیا — آئیے بحث کو سمیٹنے کے لئے

ہم اس سے مستنبط نتائج کا ایک مختصر جائزہ پیش کر دیں :

۱ — اسلامی معاشی نظام دو بنیادی اصولوں — اللہ تعالیٰ کی توحید اور انسانی مساوات — پر قائم ہے۔

۲ — اسلامی معاشی نظام ، عام مادی معاشی نظام سے اس لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے کہ اس میں انسانی مساوات کا نظریہ جو مادی معاشی نظام کا رکن اعظم ہے بدرجہ اتم موجود ہے۔ لیکن اول الذکر ، مؤخر الذکر سے اس اعتبار سے اعلیٰ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا اضافہ ہے۔ مادی معاشی نظام میں نظریہ توحید کے فقدان کی وجہ سے کئی دوسرے خدا اللہ کی جگہ لے لیتے ہیں ، جو بالاخر تباہی و ہلاکت کا موجب بنتے ہیں۔

۳ — توحید الٰہی اور مساوات انسانی ان جامع ، ہمہ گیر اور لازوال اصولوں پر مبنی ہیں۔ جو مسلسل اصلاح و فلاح کی طرف رہنما اصولوں کی حیثیت سے انسانیت کی رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ اور جن کی موجودگی سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور سب انسان ایک ہی خالق کی مخلوق بن کر برادرانہ فضا پیدا کرتے ہیں اس بھائی چارے کے ماحول سے ان کی عقلی و فکری اور ذہنی و اصلاحی قوتیں نشو و نما پاتی ہیں جو انسانی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہیں۔

۴ — اسلامی معاشی نظام اور مادی معاشی نظام میں بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ توحید الٰہی اور مساوات انسانی پر مبنی معاشرے کے افراد میں صرف اللہ کے ماتحت رہ کر ایک دوسرے کے برابر ہونے کا جذبہ ابھرتا ہے جس کے باعث سرمایہ دار ، مفلس و محتاج کو اپنے مال میں بخوشی حصہ دار خیال کرتا اور منصفانہ تقسیم دولت پر راضی ہو جاتا ہے جب کہ

مادی معاشی نظام میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور تقسیم دولت کے اندھے قانون کے ذریعے ان کی جمع کردہ دولت چھین کر مستحقین میں تقسیم کی جاتی ہے۔ لہذا جو فرق تقسیم دولت کے فطری جذبے اور تقسیم دولت کے خارجی قانون میں ہے، وہی فرق اسلامی و مادی معاشی نظام میں ہے۔

حواشی

(۱) دیکھئے تفسیر المنار، طبری، زمخشری، قرطبی وغیرہ آیت مذکورہ کے ضمن میں۔

موجودہ معاشی غلامی اور اُس کا حل

زکواۃ کے چند مصارف ''فقراء ، مساکین، غارمین اور و فی الرقاب '' کے مطابق فقر و مسکنت ، تنگ حالی و احتیاج نیز ہر قسم کی غلامیوں سے آزادی کے لئے صدر اسلام میں جو کامیاب تحریک چلائی گئی تھی اسے ملحوظ رکھتے ہوئے اب ہم اپنے موجودہ معاشی و معاشرتی حالات کا تجزیہ کر کے یہ بتائیں گے کہ ہمارے دور میں ان مصارف کی وسعتیں کہاں تک پہنچ سکتی ہیں۔

آج وہ مجبور و محکوم بدقسمت انسان جنہیں حق خود اختیاری حاصل نہ ہو، جن کی گردنیں دوسروں کے ہاتھ میں ہوں ، جو معاشی طور پر دوسروں کے غلام ہوں ، اور جنہیں اپنی جان و مال اور عزت و آبرو پر اختیار نہ ہو، کیوں نہ ' و فی الرقاب ' کے تحت آ جائیں ؟ غلامی خواہ ساتویں صدی عیسوی کی ہو یا آج کی، دونوں میں اصولاً کوئی فرق نہیں، اگر ساتویں صدی میں رائج غلامی کا انسداد اس وقت کی اسلامی حکومت کا فرض تھا تو آج کی اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ موجودہ غلامی کے ماروں کو آزاد کرائے۔

ہمارے تجزیہ کے مطابق کسانوں ، مزدوروں ، ملازموں اور کسی حد تک کرایہ داروں میں غلامی پائی جاتی ہے۔ اور ان طبقوں میں کسان سب سے زیادہ مظلوم و مجبور ہے۔ لہذا وہی مدد اور آزادی کا سب سے زیادہ مستحق بھی ہے۔ مزدور اور کرایہ دار کی حیثیت بڑی حد تک اس وقت کے مکاتب سے

ملتی جلتی ہے۔ ظلم و استبداد اور غلامی کے جتنے پھندے کسان کی گردن میں پڑے ہیں، مزدور ان میں سے بیشتر سے آزاد ہے۔ پھر مزدور کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ ان ذرائع سے قریب ہے جن سے اس کی فریاد سنا کر اس مدد کی جا سکتی ہے، اسی لئے وہ ''شہری'' کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو مزدور در اصل دیہات کی پیدا وار ہے، اگر کسان کی غلامی کا مسئلہ حل ہو جائے تو دیہات سے آنے والا کسان جو شہر میں مزدور بن جاتا ہے، شہری سرمایہ دار سے معاملہ طے کرنے میں آسانی محسوس کرے گا۔

دیہات میں عزت و ذلت کا معیار ملکیت زمین ہے جس دیہاتی کی جتنی زیادہ زمین ہے اسی لحاظ سے وہ عزت و شرف میں زیادہ ہوتا ہے۔ اور جیسے جیسے اس کی زمین کی مقدار گھٹتی جاتی ہے، اس کی ذلت و مسکنت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ دیہاتی کے ''ملکیتی طبقے'' سے نکل کر ''غیر ملکیتی طبقہ'' میں داخل ہونے پر اس کی ذلت انتہا کو پہنچ جاتی ہے، پھر ''غیر ملکیتی طبقے'' میں بھی ذلت و غلامی کے مختلف مدارج ہیں، وہ دیہاتی جو ''ملکیتی طبقے'' کی پیدا وار و دولت میں اضافہ کرنے کے بجائے اس کی معاشرتی خدمات یا جسمانی آسائش و آرام کے کام آئے، دیہاتی اصطلاح میں ''کمیں'' (کارندہ) کہلاتا ہے، ذلت کے درجہ دوم میں وہ ''غیر ملکیتی طبقہ'' ہے جو محنت و مشقت اور کھیتی باڑی کے ذریعہ ''ملکیتی طبقہ'' کی پیداوار و آمدنی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک تیسرا طبقہ ہوتا ہے جو بنیادی طور پر ''ملکیتی طبقہ'' میں شمار ہوتا ہے، اس کے پاس گو، چند بیگھے زمین ذاتی ملکیت میں ہوتی ہے جو اس کی گزر بسر کے لئے ناکافی ہونے کی وجہ سے اسے دیہات کے ''اعلیٰ ملکیتی طبقہ'' کا محتاج بنائے رکھتی ہے۔ یہ لوگ خود کو زندہ رکھنے کے لئے ''اعلیٰ ملکیتی طبقہ'' کے جس حد تک محتاج ہوتے ہیں، اسی نسبت سے ان میں ذلت و عزت

کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ دیہاتی نظام زندگی کا چوتھا طبقہ ''اعلیٰ ملکیتی طبقہ'' ہے، جس کے پاس اتنی وافر زمین ذاتی ملکیت میں ہوتی ہے جو اسے نہ صرف محنت و مشقت سے بے نیاز کر دیتی ہے بلکہ نچلے تینوں طبقات پر حکمران بھی بنا دیتی ہے۔

قدیم برہمنیت کے اصول پر ہم اپنے ملک کی دیہاتی اور شہری آبادی کو مثالاً ان طبقات میں بیان کر سکتے ہیں:

قدیم برہمنی طبقات	موجودہ دیہاتی طبقات	موجودہ شہری طبقات	نتیجہ — ملکیت و سرمائے سے قریب
برہمن	اعلیٰ ملکیتی طبقہ	اعلیٰ سرمایہ دار طبقہ	معزز ترین
کھشتری	ادنیٰ ملکیتی طبقہ	ادنیٰ سرمایہ دار طبقہ	ذلیل
ویش	کاشتکار غیر ملکیتی طبقہ	دفتری غیر سرمایہ دار طبقہ	ذلیل تر
شودر	غیر کاشتکار غیر ملکیتی طبقہ	مزدور غیر سرمایہ دار طبقہ	ذلیل ترین

اس معاشرتی تجزیئے سے ثابت ہوا کہ ہمارے ہاں عزت و ذلت کا معیار قرآن حکیم کا مقرر کیا ہوا معیار ''تقویٰ یا ایمان و عمل صالح'' نہیں بلکہ ملکیت زمین اور ملکیت سرمایہ ہے۔ ہمارے ملک کی ۹۰ فی صد آبادی آج بھی زمان و مکان کی قیود سے بے نیاز ہو کر زمانہ قبل از تاریخ کی طرح ایک بھیانک غار میں رہتی چلی آرہی ہے، اس کی جو حالت چندرگپت موریہ کے زمانہ میں تھی، وہی اشوک کے زمانے میں رہی، وہ جس حال میں محمد بن قاسم رح کے زمانے میں تھے اسی حال میں محمود غزنوی، محمد غوری، خاندان غلامان اور خاندان مغلیہ میں تھے، ان کی جو کیفیت برطانوی راج میں تھی تقریباً وہی حالت

پاکستان بننے کے پچیس برس تک موجود ہے۔ انسانوں کی یہ کثیر آبادی علم و فضل اور عقل و شعور سے جس طرح صدیوں پہلے عاری تھی اسی طرح آج بھی عاری ہے۔

برہمنیت کی انسانیت سوز تقسیم نے ان کروڑوں انسانوں کو ماضی میں بدھ مت کی طرف مائل ہونے پر مجبور کیا تھا لیکن جب بدھ مت وغیرہ ان کے دکھ کا مداوا نہ کر سکے تو انہوں نے افق ہند پر طلوع ہونے والے نئے دین کو لبیک کہا اور والہانہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ لیکن یاد رکھئے اگر اب بھی ''اہل مذہب'' نے اس دکھی انسانیت کو اسی طرح مبتلائے آلام و مصائب رکھا اور ان کے معاشی مسائل کو حل نہ کیا تو جس طرح جین مت و برہمنیت انہیں بدھ مت قبول کرنے سے باز نہ رکھ سکے، اسی طرح آج بھی ''اہل مذہب'' انہیں کوئی ''نیا طریق زندگی'' اپنانے سے باز نہ رکھ سکیں گے۔ ماضی میں اس انبوہ کثیر نے ہندومت سے اس لئے توبہ کی تھی کہ شودر کو برہمن کے حلقہ میں داخلے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ سینکڑوں سال مسلمان کہلوانے کے باوجود ''کاشتکار غیر ملکیتی طبقہ''، ''غیر کاشت کار غیر ملکیتی طبقہ''، ''دفتری غیر سرمایہ دار طبقہ'' اور ''مزدور غیر سرمایہ دار طبقہ'' کو اب تک ''اعلیٰ ملکیتی طبقہ'' اور ''اعلیٰ سرمایہ دار طبقہ'' کے حلقہ میں داخلے کی اجازت نہیں۔

''اعلیٰ ملکیتی طبقہ'' صدہا سال سے مسلمان کہلوانے کے باوجود یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس سے نچلے طبقات اس کے برابر بیٹھ سکیں اور سیاسی و جمہوری انتخابات و مجالس میں اپنا حق خود اختیاری استعمال کر سکیں، سیاسی شعور اور جمہوریت کا زبردست ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے لیکن ''اہل مذہب'' اور ''اہل سیاست'' نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ معاشی غلامی کے آہنی

پھندوں میں پھنسے ہوئے کروڑھا انسانوں کو حق خود اختیاری حاصل بھی ہے یا نہیں اور اگر موجودہ نظام معیشت قائم رہے تو آئندہ سو سال تک موجودہ چند دیہاتی اور شہری خانوادوں کے علاوہ ان کروڑھا غلاموں میں سے کوئی انتخابات لڑنے کا خواب بھی دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر موجودہ نظام معیشت قائم رہا تو نظام حکومت صدارتی ہو یا پارلیمانی، بنیادی جمہوریت ہو یا عوامی جمہوریت وہی چند لوگ جو قیام پاکستان سے مختلف روپ میں نظر آ رہے ہیں، مسلسل نظر آتے رہیں گے اور ان کے بعد ان کی اولاد، لیکن ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا کہ ”کاشت کار غیر ملکیتی طبقہ“ یا مزدور اور غیر سرمایہ دار طبقے سے کوئی فرد اپنی تمام ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کے باوجود انتخابات لڑے اور ملک کے معاشی مسائل حل کرے۔

Dr. Mahbub-ul-Haq

ڈاکٹر محبوب الحق صاحب کی تحقیق کے مطابق پاکستان کی ۸۰ فی صد آمدنی میں سے چالیس فیصد سرمائے پر بیس خاندانوں[۱] اور اے آر شبلی کی تحقیق کے مطابق تیس خاندانوں[۲] کا قبضہ ہے اور چالیس فیصد سرمایہ زرعی پیداوار سے حاصل ہوتا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ ان بزرگوں کی ”سنت حسنہ“ پر عمل کرتے ہوئے کوئی صاحب اس چالیس فی صد زرعی سرمایہ پر بھی تحقیق کر کے اس کے صحیح اعداد و شمار منظر عام پر لائیں، غالباً بقیہ چالیس فی صد سرمائے پر قابض جاگیرداروں کی تعداد اس تعداد سے زیادہ نہیں ہوگی جو غیر زرعی چالیس فی صد سرمائے پر قابض ہے۔

ان حالات میں مظلوم طبقہ اول تو اپنے آقاؤں کے ظلم و استحصال کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا اور اگر ہمت کر بھی بیٹھے تو عدل و انصاف کے دروازے تک رسائی حاصل کرنے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ نہ صرف اس کی کمر توڑ دیتی ہیں بلکہ دوسروں کے لئے عبرت کا باعث بھی بنتی

ہیں۔ صدیوں کی معاشی غلامی نے ان کی عزت و عظمت اور شعور انسانیت کو تباہ کر دیا ہے۔ وہ صرف زندہ رہنے کے لئے اپنی عزت و آبرو اور جان و مال کو اعلیٰ ملکیتی اور اعلیٰ سرمایہ دار طبقے کی حیوانی خواہشات پر بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ اس صورت حال سے مجبور ہوکر قوم کی اکثریت جرائم پیشہ یا بے غیرت و بے حمیت اور کم ہمت حیوانوں میں تبدیل ہوگئی ہے۔

جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ، ان معاشی غلاموں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف استعمال کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ انہی وجوہ کی بنا پر جب ایک دیہاتی دوسرے کو قتل کرتا ہے تو موقع پر موجود دوسرے دیہاتی، مقتول کے مدعی کے لئے گواہی دینے کی ہمت تک نہیں کرتے اور اگر کوئی دیہاتی جرأت کر ڈالے تو قاتل یا اس کے پشت پناہ خود گواہ کو قتل کی دھمکیاں دیتے ہیں اور اس طرح قاتل چند دن پولیس کے پاس رہ کر عدم شہادت کی وجہ سے عدالتوں سے رہا ہو کر دوبارہ مدعیوں کے سر پر دندنانے لگتا ہے اور اگر کوئی گواہ دھمکی سے مرعوب نہیں ہوتا تو اسے مادی لالچ دے کر خرید لیا جاتا ہے، چنانچہ ترغیب و ترہیب میں سے جو صورت بھی کارگر ثابت ہو اس سے کام لے کر گواہ کو گواہی دینے سے روک لیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا غلاموں کے اس ہجوم سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ''کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر'' کا مصداق بن سکے، اور ''ولا یاب الشھداء اذا ما دعوا (۲ : ۲۸۲) گواہ جب بلائے جائیں تو وہ گواہی دینے سے انکار نہ کریں اور ''ولا تکتموا الشھادۃ'' (۲ : ۲۸۳) اور گواہی نہ چھپاؤ، اور ''کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم'' (۴ : ۱۳۵) تم انصاف قائم کرنے والے، اللہ کے لئے صحیح گواہی دینے والے بنو خواہ اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو، کے قرآنی اصولوں پر عمل کر سکے؟

جو قوم اپنی جان و مال اور عزت و آبرو تک کی حفاظت سے محروم ہو اور اخلاقی طور پر آبروباختہ، بزدل و ناکارہ ہو، وہ کیسے قرآن کے ان اعلیٰ اصولوں پر عمل کرنے کی ہمت کر سکتی ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ دیہات کا ''اعلیٰ ملکیتی طبقہ'' دیہاتی معاشی غلام سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لے کر اپنی پیداوار اور ذرائع پیداوار میں انتہائی حد تک اضافہ کر لینے اور اس کے خون کا آخری قطرہ نچوڑ لینے کے بعد، معاشی غلام کے جسمانی ڈھانچے کا سودا، شہری اعلیٰ سرمایہ دار طبقے سے کرتا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب شہری اعلیٰ سرمایہ دار طبقہ اپنی مرضی و منشا کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے، تاکہ اس حکومت کے قائم کئے ہوئے نظم و نسق کے تحت اپنی پیداوار اور ذرائع پیداوار میں اضافہ کرے، تو وہ اپنی مرضی اور اپنی پسند کے سیاسی لیڈر بطور ایجنٹ دیہاتی اعلیٰ ملکیتی طبقے کے پاس بھیجتا ہے تاکہ وہ ان کے ماتحت معاشی غلاموں کا سودا کریں اور ان کے ووٹوں کے عوض اعلیٰ سرمایہ دار طبقے کے ایجنٹ سیاستدان بر سر اقتدار آنے کی شرط پر اعلیٰ ملکیتی طبقے کو ایک طرف تو روٹ پرمٹ، لائسنس اور سرکاری لگان کی معافی وغیرہ کی صورت میں مراعات عطا کریں، اور دوسری طرف چوری، ڈاکے، زنا، اغواء، شراب نوشی، قتل وغارت وغیرہ جرائم میں ان کی پشت پناہی کریں ۳، اس طرح شہری اعلیٰ سر مایہ دار طبقہ، دیہاتی اعلیٰ ملکیتی طبقہ کے ساتھ دیہاتی اور شہری معاشی غلاموں پر ظلم و استبداد میں براہ راست شریک ہو جاتا ہے۔ اور اس گٹھ جوڑ اور ''تعاون علی الاثم'' کے ذریعہ سے جو حکومت بر سر اقتدار آتی ہے وہ اپنے ووٹر (معاشی غلاموں) کے حقوق پائمال کرتی اور ان میں بیداری پیدا کرنے والی ہر تحریک کو دبا دیتی ہے۔

یہ سودا بازی صرف اندرون ملک ہی ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اعلیٰ

سرمایہ دار طبقہ '' ان معاشی غلاموں '' کی کثرت، ملکی رقبے کی وسعت اور جدید سیاسی حالات سے فائدہ اٹھا کر ان کے عوض غیر ملکی قرضے، غیر ملکی زر مبادلہ، بین الاقوامی تجارت وغیرہ کی سہولتیں بھی حاصل کرتا ہے۔ اس طریقے سے یہ معاشی غلام بکتے بکتے بین الاقوامی لٹیروں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور بالآخر ان کی معاشی غلامی کے پھندوں میں بین الاقوامی سامراج کے ایک اور پھندے کا اضافہ ہو جاتا ہے، دیکھئے ڈایاگرام صفحہ ۳۲۔

ہمارے خیال میں بیکاری، معاشی غلامی، جہالت اور بیماری، ذلت کے وہ طوق ہیں جو اس وقت ملک کی اکثریت کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور قوم کی یہی کمزوریاں اعلیٰ ملکیتی طبقے اور اعلیٰ سرمایہ دار طبقے کے لئے مزید قوت کا باعث بن جاتی ہیں، کیا امت مسلمہ کے گلے سے ان طوقوں کو اتار کر سواد اعظم کو آزاد کرانا '' وفی الرقاب '' اور '' فک رقبہ '' نہیں؟

اب سوال یہ ہے کہ دور حاضر کے '' معاشی غلاموں '' کی گردنوں کو کیوں کر چھڑایا جائے؟ قرون اولیٰ میں اس پر دو طریقوں سے عمل ہوا۔ عہد رسالت میں اخلاقی طور پر، اور عہد خلافت راشدہ میں اخلاقی اور قانونی دونوں طریقوں سے، اور اس کے بعد کے ادوار میں قانون، اخلاق پر غالب رہا، قرآن حکیم کی آیت '' ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم و اموالھم '' کے مطابق عہد رسالت میں تمام مسلمانوں کے انفس و اموال ان کے اپنے نہ تھے بلکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے جان و مال سرور کائنات ص کے حوالے کر رکھے تھے۔ اور مسلمانوں میں اداء امانت اور ذمہ داری کا احساس اس درجہ بیدار ہو چکا تھا کہ اللہ کی مرضی پوری کرنے کے لئے وہ اپنے ہر اختیار سے دست بردار ہو جاتے تھے '' و ما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ و رسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم (۳۶ : ۳۳) خلافت راشدہ میں بعض لوگوں نے رسول اکرم ص

کی دی ہوئی امانتوں کا تحفظ نہ کیا تو خلفاء راشدین قانون کو حرکت میں لانے پر مجبور ہوئے اور انسانیت کی فلاح و بہبود میں حائل ہونے والوں کو بزور قوت و قانون سیدھا کر دیا۔ عہد صدیق اکبر رض کے تجربے سے جناب فاروق اعظم رض اس نتیجے پر پہنچے کہ عامۃ المسلمین کی مالی محبت کو محدود کرنے کے لئے اخلاقی ضابطوں کے ساتھ قانون کی بندشیں بھی ضروری ہیں۔

حضرت عمر رض کے عہد میں سواد عراق کا علاقہ فتح ہوا، جو اپنے وسیع رقبے اور زرعی پیداوار کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل تھا، عہد رسالت میں خیبر وغیرہ کی تقسیم کے پیش نظر بعض مسلمانوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ سواد کا مفتوحہ وسیع و عریض زرخیز زرعی علاقہ متعلقہ مجاہدین میں منقسم ہو جانا چاہئے، حضرت بلال رض اور عبد الرحمان بن عوف رض اس موقف کے سرگرم حامی تھے۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رض کا موقف یہ تھا کہ اس مفتوحہ زمین کو انفرادی یا نجی ملکیت میں دے دینے سے ان مفادات کا خاتمہ ہو جاتا ہے جن کے قیام کے لئے اسلام ایک عالمی تحریک کی صورت میں دنیا سے معاشی بے انصافی اور اقتصادی بے راہ روی کو دور کرنا چاہتا ہے۔ اس کے خلاف عبدالرحمان بن عوف رض نے کہا:۔

سواد عراق کی زمین اور دھقان تو اللہ تعالیٰ نے اس لئے مجاہدین کو عطا کئے ہیں کہ انہیں ان میں تقسیم کر دیا جائے ۴۔

اور یہ کہ:

اللہ نے جو علاقے ہمیں ہماری تلواروں کے بل پر عطا کئے ہیں، کیا آپ انہیں ایسے لوگوں کے لئے روک رکھیں گے جو موجود نہیں، نہ جنگ میں شریک ہوئے، آپ ان کو آئندہ نسلوں اور ان نسلوں کی آئندہ نسلوں کے لئے روک رکھنا چاہتے ہیں جو موجود بھی نہیں؟ ۵۔

اس سے ثابت ہوا کہ اس موقف کے حامی صحابہ کے نزدیک ان مفتوحہ زمینوں کی صورت کچھ اس طرح تھی :-

۱ - ان کی ملکیت فاتحین کا قانونی حق تھا -

۲ - یہ ان فاتحین کا ایسا قانونی حق تھا جس میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا شریک نہ تھا -

۳ - انھیں اپنی ان زمینوں پر کلی مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے اور وہ زمینیں عامۃ المسلمین کو چھوڑ کر صرف ان کی اولاد میں وراثۃً منتقل ہوتی رہیں گی -

۴ - یہ زمینیں ان کی نجی ملکیت تھیں - جن میں حکومت کو سوائے سرکاری محصولات ، عشر وغیرہ کی وصولی کے کسی مداخلت کا حق نہ ہوگا - امیر المومنین حضرت عمر فاروق رض نے ان الفاظ میں ان کی تائید کی :-
” اس کی نوعیت تو وہی ہے جو تم بتا رہے ہو“ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا :
” لیکن میں اس کی تقسیم کے حق میں نہیں۶ “ -

ان کے دلائل کا خلاصہ یہ تھا کہ زرعی و زرخیز زمینیں اور اس کے کاشت کاروں کو ، جو اس وقت کا سب سے بڑا ذریعہ پیداوار ہیں ، لوگوں کی نجی ملکیت بنا دینے کی صورت میں :

۱ - بنجر اور غیر زرخیز زمین آباد کرنے کے لئے وسائل کہاں سے آئیں گے ؟

۲ - ملکی دفاع اور سرحدوں کی حفاظت کہاں سے کی جائے گی ؟

۳ - مجاہدین کے جاگیردار بن جانے کی صورت میں جہاد کون کرے گا ؟ اور کون دشمنوں کو ملک و ملت کی سرحدوں سے دور رکھے گا ؟

۴ - کم سن بچوں ، بیواؤں (فقراء و مساکین ، غرباء و معذورین) کی ضروریات زندگی کی کفالت کہاں سے ہوگی ؟ ۔

امیر المومنین کے ان دلائل کے باوجود لوگوں نے زمین کو نجی ملکیت میں لینے پر اصرار کیا ۔ چنانچہ کئی دن کی بحث و تمحیص کے باوجود کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ۔ آخر کار اس بحث میں تقریباً غیر جانبدار رہنے والے انصار کے دو بڑے قبیلوں ، اوس و خزرج کے اشراف پر مشتمل دس افراد کی ایک نمائندہ کمیٹی منتخب کی گئی ، جسے " فل بنچ " کے اختیارات دیئے گئے اور انھیں کے فیصلے کو حتمی فیصلہ قرار دیا گیا ۔

حضرت عمر رض نے اپنے دلائل کو ان کے سامنے یوں پیش کیا :

" آپ حضرات نے ان لوگوں کی باتیں سن لیں جن کا خیال ہے کہ میں ان کی حق تلفی کر رہا ہوں . . . ان لوگوں کو غنیمت میں جو ملا تھا ، اس کو میں نے اس کے مستحقین میں تقسیم کر دیا ہے . . . میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ زمینوں کو مع کاشتکاروں کے سرکاری ملکیت قرار دے دوں ، اور اس کے کاشتکاروں پر خراج عائد کر دوں اور ان پر فی کس جزیہ مقرر کر دوں ۔ جسے وہ ادا کرتے رہیں ۔ اس طرح یہ جزیہ اور خراج مسلمانوں کے لئے ایک مستقل فیء (اجتماعی آمدنی) بن جائے گی ۔ فوج ، کم سن افراد ، اور آنے والی نسلیں اس میں حصہ دار ہوں گی ، دیکھئے ، ان سرحدوں کی حفاظت کے لئے بہر حال کچھ آدمی تعینات کرنے ہوں گے ، جو مستقل فوج کی حیثیت سے وہاں رہیں گے بڑے بڑے علاقے جیسے شام ، الجزیرہ ، کوفہ ، بصرہ ، مصر میں فوجی چھاؤنیاں قائم کرنی ہوں گی ۔ اور ان فوجیوں کو تنخواہیں دینا ہوں گی ، اور اب اگر یہ زمینیں اور ان پر محنت کرنے والے کاشت کاروں کو ان میں تقسیم کر

دیا جائے تو ان کے اخراجات کہاں سے پورے کئے جائیں گے ۸ ''۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم رض نے ''فل بنچ '' کے سامنے اپنے موقف کی تائید میں اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے، آخر میں قطعی دلیل پیش کرتے ہوئے فرمایا : یہ لوگ قرآن حکیم کی ان آیات کو اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں جن سے انہیں فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن جو آیات میرے موقف کی تائید کرتی ہیں انہیں بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پھر آپ نے سورۃ الحشر کی آیت نمبر ٦ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بنو نضیر کے سلسلے میں نازل ہوئی تھی چنانچہ ان کا قصہ تمام ہو چکا۔ اب یہ بات تمام بستیوں کے لئے عام ہے ۹ ، پھر آپ نے مذکورہ سورۃ کی ساتویں اور آٹھویں آیتیں پڑھیں، جن میں (مفتوحہ زمین وغیرہ) کی تقسیم کا ذکر ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ان لوگوں کے ساتھ اور لوگوں کو بھی شامل کر لیا ، جن کا ذکر آیت نمبر ۹ میں ہے۔ چنانچہ یہ آیت جیسا کہ ہمیں معلوم ہے خاص طور پر انصار کی شان میں نازل ہوئی تھی ، اللہ تعالیٰ نے اس پر ہی بات ختم نہیں کی بلکہ ایک اور گروہ کو بھی ان کے ساتھ شامل کیا اور فرمایا :

''و الذین جاءوا من بعدھم''۔ اور یہ فئے (مفتوحہ زمین) ان لوگوں کے لئے بھی ہے جو ان کے بعد آئیں گے۔ اس آخری آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حضرت عمر رض نے فرمایا : یہ آیت ان لوگوں (مہاجرین و انصار) کے بعد آنے والے تمام لوگوں کے لئے عام ہے۔ اس کی رو سے اب یہ زمین (فئے) ان تمام مذکورہ لوگوں کا مشترکہ حق قرار دی جا چکی ہے۔ اب یہ کس طرح ہو

سکتا ہے کہ ہم ان زمینوں کو موجودہ لوگوں کے درمیان ہی تقسیم کر دیں اور ان کے بعد آنے والوں کو ان کے حصہ سے محروم کر دیں ۱۰۔

امام ابو یوسف بیان کرتے ہیں کہ انصار مدینہ کے اکابر و اشراف پر مشتمل دس ججوں کے (فل بنچ) نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد اپنا فیصلہ سنایا اور یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ فیصلہ مفتوحہ زمینوں کو جاگیروں کی صورت میں دینے یا نہ دینے کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر کا واضح فیصلہ تھا۔ چونکہ مقدمے کا آغاز امیر المومنین کے موقف کے مخالفین کے دلائل کی سماعت سے ہوا تھا اور اختتام حضرت عمر رض کے دلائل پر، اس لئے ججوں نے حضرت عمر رض کے دلائل کے اختتام پر اپنا فیصلہ ان الفاظ میں سنایا:

"اے امیر المومنین! آپ کی رائے (صحیح) ہے، آپ نے جو فرمایا وہی درست ہے اور وہی حقیقت ہے اور جو رائے آپ نے قائم کی ہے وہی سب سے موزوں اور حقیقت حال کے عین مطابق ہے۔ اگر ان شہروں اور سرحدوں میں افواج نہیں رکھی جائیں گی اور ان کے لئے بطور تنخواہ کچھ مقرر نہیں کیا جائیگا تو اہل کفر اپنے شہروں پر پھر سے قابض ہو جائیں گے" ۱۱۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رض ججوں کے اس فیصلے کو اپنے حق میں پاکر بے حد خوش ہوئے اور فرمایا اب مجھ پر اس معاملہ کا ہر پہلو واضح ہو گیا ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں رہی جو اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے راستے میں حائل ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ کون ایسا ماہر اور دانش مند ہے جو ان زمینوں کا مناسب طور پر بندوبست کرے اور کاشت کاروں پر ان کی برداشت

کے مطابق خراج تجویز کرے؟ چنانچہ بالاتفاق حضرت عثمان بن حنیف، جو اس کام میں تجربہ رکھتے تھے، اس خدمت پر مامور کر دیئے گئے ۔ اور تمام صحابہ کے اجماع سے یہ معاملہ مستقل طور پر طے پا گیا ۔ چنانچہ اس کے بعد جب شام وغیرہ فتح ہوئے تو اسی اصول کے تحت وہاں کی مفتوحہ زمینیں حکومت کی ملکیت قرار پائیں ۔ اور کسی مسلمان نے ان مفتوحہ ممالک کی زمینوں کو جاگیروں میں تقسیم کرنے کی خواہش نہیں کی ۔

قرآن و سنت اور اجماع صحابہ کرام کے اس فیصلہ سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں :

۱ ۔ عہد رسالت کا اخلاقی ضابطہ ایک غیر معمولی قانون تھا جس کے تحت رسالت مآب ص کے تربیت یافتہ صحابہ کرام اپنی جان اور مال کو اللہ و رسول کی امانت خیال کرتے تھے اور بوقت ضرورت ایک سچے امین کی حیثیت سے جان کی ضرورت پڑتی تو جان ، اور مال کی ضرورت پڑتی تو مال ، بے دریغ اور بلا جھجک اپنے مالک حقیقی کے سپرد کر دیتے تھے ۔ اس لئے عہد رسالت میں صحیح اسلامی تصور کے مطابق ذاتی ملکیت کے بجائے امانت کا تصور غالب تھا ۔

۲ ۔ سرور کائنات صلعم کی عدم موجودگی اور شمع نبوت کے پروانوں میں غیر صحابہ کی کثرت ہو جانے کی وجہ سے عہد رسالت کا اخلاقی ضابطہ عامۃ المسلمین کے لئے ایک غیر معمولی قانون تھا ۔ جس کے اعلیٰ معیار پر پورا اترنا ان کے بس کی بات نہ تھی ۔ اس لئے مخلوط اقوام و ملل پر مشتمل مفتوحہ اقوام کی آبادی کی کثرت کو محض اخلاقی ضابطے پر کاربند رکھنا آسان نہ تھا ۔ چنانچہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رض نے صحابہ

کرام کے اجماعی فیصلے کے مطابق عہد رسالت کے اخلاقی ضابطے کو قانونی شکل دی تاکہ عامۃ الناس کو آسانی سے اللہ و رسول ص کی تعلیمات کے مطابق چلایا جا سکے۔

۳۔ قرآن و سنت اور اجماع صحابہ کرام پر مبنی اسلامی قانون کی رو سے اسلامی حکومت ملک کی دولت اور ذرائع دولت کو چند ہاتھوں میں محدود ہونے سے روکے گی۔

۴۔ اگر عہد رسالت کا سا اخلاقی ضابطہ رائج ہو سکے تو ملک میں بعض ذمہ دار افراد کو بطور امین نجی ملکیت رکھنے کی اجازت ہو گی۔

اللہ رب العالمین کی ہدایت اور رسول مقبول ص کی تعلیمات پر مبنی صحابہ کرام کے اجتماعی نظام معیشت کو مختلف زمانوں میں فقہاء اور مفسرین بیان کرتے چلے آئے ہیں پانچویں صدی ہجری میں امام ابن حزم رح اپنی شہرہ آفاق تصنیف المحلیٰ (کتاب الزکاۃ) میں فرماتے ہیں کہ اگر اسلام کا اجتماعی نظام معیشت انتشار کا شکار ہو جائے اور بعض افراد مسلمانوں کے اجتماعی ذرائع پیدا وار پر قابض ہو کر اہل ثروت بن بیٹھیں اور عامۃ المسلمین فقرو احتیاج اور غربت و افلاس میں مبتلا ہو جائیں اور اہل ثروت اپنی بے پناہ دولت سے گنتی کے چند روپے بطور زکواۃ ادا کر کے عامۃ الناس کے حقوق سے بے نیاز ہو جائیں تو حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اہل ثروت پر جبر کر کے ذرائع پیدا وار پر قبضہ کرے اور ملکی ذرائع پیدا وار کا ایسا انتظام کرے جس سے عامۃ الناس کے حقوق پورے پورے ادا ہوں۔

”فقہاء عام طور پر ایک پیاسے کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ جان بچانے کے لئے کسی کا پانی پی لے اور اگر اسے یہ پانی لڑ کر بھی حاصل

کرنا پڑے تو اسے ایسا کرنے کی اجازت ہے ‘‘ ۔ امام ابن حزم رح فقہاء کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر ایک پیاسے کو لڑ کر پانی حاصل کرنے کی اجازت ہے تو ایک بھوکے کو لڑ کر روٹی حاصل کرنے کی کیوں اجازت نہیں اور ایک ننگے کو لڑکر لباس حاصل کرنے کی کیوں اجازت نہیں ؟ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ اگر ملک میں کوئی فرد یا گروہ بھوکا یا ننگا ہو اور ملک میں ایسا نظام معیشت رائج ہو جو انہیں بھوکا اور ننگا رکھے تو از روئے قرآن و سنت و اجماع و قیاس یہی قانون ہے کہ بھوکے ننگے زبردستی اپنی بھوک و عریانی کا مداوا کریں اور اہل ثروت جنہوں نے ملک کی اجتماعی معیشت کو انفرادی ملکیت میں لے رکھا ہو، ان کے خلاف بغاوت کر کے انفرادی ملکیت کو دوبارہ اجتماعی ملکیت میں لیں تا کہ ملک سے فقر و فاقہ دور ہو اور عدل و انصاف پر مبنی معاشی نظام قائم ہو جائے ۔ اس ضمن میں امام ابن حزم رح لکھتے ہیں : ۔

اگر کوئی شخص فقر و فاقہ کا شکار ہو جائے اور اس کے پڑوس میں کوئی صاحب ثروت شخص موجود ہو تو ایسی صورت میں فقر و فاقہ میں مبتلا ہونے والا شخص مضطر (مجبور) نہیں ہوگا کہ مردار یا سور کا گوشت اس کے لئے حلال ہو جائے بلکہ ایسی صورت میں مالدار مسلم یا ذمی کا فرض ہے کہ وہ اس محتاج کے ذریعۂ معاش کا انتظام کرے اور اگر اہل ثروت اس کا انتظام نہیں کرتے تو مضطر پر واجب ہے کہ مردار یا سور کا گوشت کھانے کے بجائے اہل ثروت سے اپنی معاش حاصل کرے اور اس سلسلے میں یہ مفلس و محتاج شخص جو راستہ بھی اختیار کرے گا وہ جائز ہو گا بلکہ اسلام یہاں تک اجازت دیتا ہے کہ بیکار و مفلس و محتاج و فقیر اہل ثروت کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کریں اور ان کے خلاف بغاوت کریں اور ان سے باقاعدہ جنگ کر کے اپنے

حقوق حاصل کریں اور اگر بیکار و مفلس مجاہدین اہل ثروت کے خلاف جنگ میں مارے جائیں تو "شہید القود" (ایسے شہید جن کا خون بہا لیا جائے گا) کہلائیں گے اور اگر اہل ثروت و سر مایہ دار تباہ ہو جائیں تو ان پر اللہ کی لعنت۔ یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے ایک ایسا نظام معیشت قائم کر رکھا تھا جس کے ذریعے محتاج و مفلس لوگ پیدا ہوتے ہیں اور اس کے ذریعے سر مایہ دار غریبوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دار، عامة المسلمین اور اسلام کا باغی طبقہ (و هو طائفة باغية) ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اگر مسلمانوں میں سے ایک طبقہ باغی ہو جائے تو اس باغی طبقے کے خلاف اعلان جنگ کرو اور ان سے اس وقت تک لڑو جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے نظام کی طرف پلٹ نہ آئے، اور سر مایہ دار جو ملک میں فقر و محتاجی باقی رکھتے ہیں اللہ کے باغی ہیں کیونکہ انہوں نے ایک ایسا نظام معیشت قائم کر رکھا ہے جس کے ذریعے انہوں نے بیشمار مسلمان بھائیوں کے ذرائع و وسائل پیدا وار پر قابض ہو کر انہیں محروم و محتاج بنا رکھا ہے ۱۲

امام الزمخشری اپنی مشہور عالم تفسیر "الکشاف" میں ۱۳ سورة النحل کی آیت نمبر ۷۱ "و اللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق فما الذین فضلوا برادی رزقهم علی ما ملکت ایمانهم فهم فیه سواء" اللہ تعالیٰ نے تم میں بعضوں کو بعضوں پر رزق میں فضیلت دی ہے، وہ اپنے حصہ کا مال اپنے غلاموں کو اس طرح کبھی دینے والے نہیں کہ وہ (مالک و مملوک) سب اس میں برابر ہو جائیں، کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ تمہارے غلام در اصل تم ہی جیسے انسان ہیں اور وہ تمہارے بھائی ہیں اس لئے اہل ثروت پر اللہ کی طرف سے یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جو مال و دولت ان کے پاس ان کی ضروریات زندگی سے زاید ہو وہ اسے ان معاشی غلاموں کی طرف لوٹا دیں، یہاں تک کہ وہ معاشی طور پر بالکل

تمہارے برابر ہو جائیں وہ بھی وہی پہنیں جو تم پہنتے ہو، اور وہی کھائیں جو تم کھاتے ہو،،۔ امام الزمخشری نے اس آیت سے یہ مطلب نکالا کہ اگر کسی وقت قرآنی تعلیمات پر مبنی نظام معیشت ٹوٹ جائے اور اهل ثروت پیدا ہو جائیں تو ایسی صورت میں سرمایہ دار طبقہ کو دوبارہ قرآن حکیم کی اتباع کرنی چاھئے۔ اپنے اس موقف کی تائید میں امام الزمخشری، بخاری، مسلم اور اصحاب السنن کی ایک حدیث بیان کرتے ھیں کہ حضرت ابوذر رض نے آنحضرت صلعم سے ایک دفعہ یہ سنا کہ تمہارے غلام دراصل تمہارے بھائی ھیں، اس لئے انہیں وہ پہناؤ جو تم پہنتے ہو اور وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو، کہا جاتا ھے کہ اس کے بعد ابوذر رض کے غلام کو جب کبھی دیکھا گیا تو اس کی چادر اسی طرح کی ہوتی تھی جس طرح کی ابوذر رض کی، اور اس کی لنگی اسی طرح کی ہوتی تھی جس طرح ابوذر رض کی۔ گویا امام الزمخشری کی تفسیر کے مطابق آقا و غلام کا باھمی رشتہ بھائی چارے کا ھے اور آقا و غلام کا تعلق اسلامی تعلق نہیں۔

۸ امام فخرالدین الرازی اپنی التفسیر الکبیر میں سورۃ التوبة ۱۲ کی زکواۃ والی آیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ھیں:۔

قرآنی نظام معیشت کی بنیاد اس اصول پر ھے کہ اللہ و رسول ص پر ایمان رکھنے والا شخص صرف اسی حد تک دولت و ذرائع دولت سے استفادہ کرتا ھے جس سے وہ اپنی ضروریات زندگی پوری کر سکے اور جس نقطے پر اس کی احتیاج پوری ہو جائے اس سے آگے جو کچھ اس کے پاس ہو اس سے بے نیاز ہو جائے، انہوں نے اس اصول کو اپنے حکیمانہ انداز میں یوں بیان کیا ھے: ،،الاستغناء عن الشی،، ،، الاستغناء بالشی،، سے اعظم و افضل ھے، کیونکہ ،، الاستغناء بالشی سے مراد،، یہ ھے کہ انسان کو کسی چیز کی احتیاج ہو اور اسے لے کر وہ اپنی احتیاج پوری کرے اور دوسری چیزوں سے بے نیاز ہو جائے، جب کہ ،،الاستغناء عن الشی،، کا تعلق ،، الغنی التام ،، (مکمل بے نیازی) سے ھے، لہذا ،،الاستغناء عن الشی،، حق

تعالیٰ کی صفت ہے اور "الاستغناء بالشی" انسان کی۔ اس پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے امام رازی لکھتے ہیں کہ قرآن کا نظام معیشت انسان کو حق تعالیٰ کی صفات کی طرف رهنمائی کرتا ہے اس لئے اس نظام کا تقاضه یه ہے که مسلمان ایسا نظام معیشت قائم کریں جس کے تحت تمام مسلمان صرف اسی حد تک انفرادی معیشت سے فائده اٹھائیں جس حد تک ان کی احتیاجات پوری هو جائیں اور ظاهر ہے یه صرف اسی صورت میں ممکن هو سکتا ہے جب قرآنی تعلیمات پر مبنی اجتماعی نظام معیشت قائم هو۔

هر وه نظام معیشت جو عامة المسلمین کے معاشی مسائل حل نهیں کر سکتا، غیر اسلامی ہے، همارے موجوده نظام معیشت کو، اسلامی نظام معیشت میں ڈهالنے کی ضرورت ہے۔ سوال پیدا هوتا ہے که کسی نظام معیشت کو اسلامی نظام معیشت میں کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے، تاکه ارشاد قرآن حکیم کے مطابق غلامی سے آزادی دلانے پر عمل هو سکے اس سلسلے میں هم مندرجه ذیل چند تجاویز پیش کرتے هیں:۔

۱ - توحید باری تعالیٰ اور انسانی مساوات پر مبنی ملک گیر تحریک چلائی جائے، جو قرآن حکیم کے ان دو بنیادی اور عالم گیر اصولوں کو ملک کے گوشے گوشے میں پهیلا دے اور هر مسلمان توحید کی عظیم الشان قوت سے سرشار هو کر انسانی مساوات کی راه میں حائل هر قوت کا مقابله کر سکے اور معاشی عدل و انصاف کے راستے سے هر رکاوٹ دور کر دے۔

۲ - توحید باری تعالیٰ اور انسانی مساوات کے اصولوں کی نشر و اشاعت سے عز و شرف کا معیار صالحیت و تقویٰ قرار پائے اور عز و شرف کا موجوده نظام جو حسب و نسب، جاه و حشمت اور مال و دولت پر قائم ہے اور

جو قدیم برھمنیت کے ذات پات کے اصولوں کی یادگار ھے، ختم کر دیا جائے۔

۳ - مندرجہ بالا اصولوں کی ھمہ گیر اشاعت کے ساتھ اسلامی قانون معیشت کو حرکت میں لایا جائے۔ اور جو لوگ رضاکارانہ اسلامی نظام معیشت کی طرف مائل نہ ھوں انھیں قانون کے ذریعے مجبور کیا جائے کہ وہ مفاد عامہ کی خاطر ملکی دولت اور ذرائع دولت سے دست بردار ھوجائیں۔

۴ - امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم رض نے قرآن و سنت کی روشنی میں جو فیصلہ کیا تھا اس پر عمل کرتے ھوئے ملکی دولت اور ذرائع دولت کو مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت میں لے لیا جائے اور حکومت بطور امین اس سے عامة المسلمین کی بنیادی ضروریات زندگی پوری کرنے کا انتظام کرے۔ تاکہ ملک و قوم مسلسل ترقی کرتے رھیں۔ اسلام کا نظام زکواۃ صرف اسی صورت میں مفید و کارآمد نتائج پیدا کر سکتا ھے جب مندرجہ بالا اسلامی قانون معیشت کے تحت اسلام[۴] کا اجتماعی نظام معیشت قائم ھو۔ معاشی غلامی کے حل میں پاکستان کے باقی مسائل کا حل موجود ھے

پاکستان کا استحکام و بقا اور اسلام کے اپنے مستقبل کا فیصلہ پاکستان میں معاشی غلامی کے مسئلے کے حل پر منحصر ھے۔

حواشی

۱ - ھفت روزہ نصرت ، شمارہ ۴ ، مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۶۹ء لاھور

۲ - روزنامہ امروز ، اگست ۱۹۶۹ء لاھور

۳ - ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل حالات یہی تھے ، ان انتخابات نے اس نظام میں کچھ تبدیلی پیدا کی ہے

۴ - ابو یوسف ، کتاب الخراج ، ص ۱۶۰

٥ - ایضاً ص ١٦١

٦ - ایضاً ص ١٦٠

٧ - ایضاً ص ١٦٥

٨ - ایضاً ص ٣ - ١٦٢

٩ - ایضاً ص ١٦٥

١٠ - ایضاً ص ١٦٧

١١ - ایضاً ص ١٦٣

١٢ - ابن حزم ' المحلیٰ ' کتاب الزکواۃ ص ١٥٩

١٣ - الز مخشری، الکشاف ، تفسیر سورۃ النحل آیت نمبر ٤١

١٤ - الرازی ، التفسیر الکبیر ، سورۃ التوبۃ آیت نمبر ٦٠

زکواۃ اور مسئلہ تعلیم

ادیان عالم میں اسلام ہی وہ دین ہے جس نے علم کو ایمان کے لئے ضروری قرار دیا ہے ، سب سے پہلی وحی میں ارشاد ربانی ہے : '' اقرأ باسم ربك الذی خلق '' اور '' اقرأ و ربك الا کرم الذی علم بالقلم '' (۹۶ : ۱، ۲ ، ۳) پڑھئے اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا ، اور پڑھئے بحالیکہ آپ کا رب اکرم وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم عطا کیا ۔ علم کی اہمیت کے پیش نظر اللہ نے رسول اللہ ؐ کو معلم کتاب و حکمت بنا کر بھیجا ۔ انسان میں نا معلوم کو معلوم کرنے کی صلاحیت بخشی : '' علم الانسان مالم یعلم '' ۔ نیز علوم و فنون کی حفاظت اور ابلاغ عام کے لئے انسان کو قلم کا استعمال سکھایا ۔ اور اعلان فرمایا کہ بندگان خدا میں سے صرف علماء ہی اللہ کا خوف رکھتے ہیں ۔ کفر و نفاق میں مبتلا رہنے والوں کے لئے فرمایا کہ ان کی یہ حالت اس لئے ہے کہ وہ بے علم ہیں ۔

ایمان کے لئے علم کی ضرورت کے اس قرآنی تصور نے پیروان اسلام میں ایک زبردست انقلاب بپا کیا جس نے تاریخ عالم میں نہایت دور رس اثرات پیدا کیئے ، ایمان کی تکمیل کے لئے علم میں اضافہ کی تلقین نے مسلمانوں کو نہ صرف عبادات کی تفصیلات اور معاملات کی جزئیات سے واقفیت حاصل کرنے کی رغبت دلائی بلکہ کائنات کی تسخیر پر بھی آمادہ کیا ۔ اسلامی عبادات کا تصور بذات خود

ایک انقلابی تصور ہے۔ ہر عبادت کسی نہ کسی طرح انفرادی و معاشرتی تعلقات کی آئینہ دار ہے۔ لیکن معاملات کا دائرہ تو اتنا وسیع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ، اسلام کی اصولی تعلیمات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ۔ عبادات و معاملات کی اس گہری ہم آہنگی کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے ہر مسلمان پر فرض عائد ہوا کہ وہ ایمان ، نماز ، روزہ ، حج ، زکواۃ کی تفصیلات جاننے کے ساتھ حلال و حرام ، نکاح و طلاق ، صلح و جنگ ، اطاعت و عصیان ، معاشرتی و عائلی قوانین کے بارے میں بھی تعلیم حاصل کرے ، باصلاحیت اور با شعور افراد پر مبنی معاشرے کی تشکیل کے ساتھ قرآن نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ اسلام روئے عالم کے ادیان پر غالب آئے گا ۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ معاشرت، معیشت ، سیاست ، تہذیب اور تمدن کے اعلیٰ اصولوں کی تعلیم کے ساتھ ان علوم کی طرف رہنمائی بھی کرتا جو طبیعیات سے متعلق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انفس و آفاق پر غور و تدبر کا حکم دیا ۔ ارض و سماء اور ان کے درمیان کی موجودات کو سمجھنے ، نباتات و جمادات پر غور کرکے نتائج اخذ کرنے اور اجرام فلکی پر غور و فکر کر کے انہیں مسخر کرنے کی تاکید کی ۔ چنانچہ قرآن حکیم ایک طرف سابق انبیاء کی تعلیمات کا مہیمن ہے اور دوسری طرف عقل سے کام لینے کی دعوت دے کر علت و معلول پر مبنی اصولوں سے استفادہ کی تعلیم دیتا ہے ۔ اسی حسین امتزاج کو قرآن حکیم نے کتاب و حکمت کے نام سے بیان کیا ہے ۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ قرآنی حکمت نے انسانوں کو محض سخن طرازی اور نکتہ پروری سے ہٹا کر علم و عمل کا مسلسل ترقی کرنے والا قافلہ بنا دیا تھا ۔

اب ہم قرآن مجید کی چند مثالوں سے اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ ایمان کے لئے علم ضروری ہے :

قرآن مجید میں ہے : ” فاعلم انہ لا الہ الا اللہ “ (۴۷:۱۹) جان لو کہ اللہ

کے سوا کوئی معبود نہیں، امام بخاری اپنی جامع صحیح کتاب العلم میں اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے باب باندھتے ہیں کہ ”العلم قبل القول و العمل ۱“، یعنی علم، قول و عمل سے پہلے ہے، مذکورہ بالا آیت یہ بتا رہی ہے کہ ”لا الٰہ الا اللہ“ کہو تو علم سے کہو: فبدأ بالعلم ۲، شاید اسی کی تفسیر کرتے ہوئے شیخ سعدی رح نے فرمایا تھا:

چو شمع از پے علم باید گداخت　　که بے علم نتوان خدا را شناخت

دوسری جگہ ارشاد ہے:

”لا تکونن من الجاھلین“ (۶:۳۵) تو ہرگز جاہلوں میں سے مت ہونا۔

ایمان و علم پر زور دینے کے لئے ایک جگہ جہالت پر قانع رہنے والوں کو تنبیہ کی ہے کہ انہیں ایمان کو برقرار رکھنے کے لئے جہل اور گنوارپن کو چھوڑنا ہوگا، ارشاد ہے:

”قالت الاعراب امنا ط قل لم تومنوا و لکن قولوا اسلمنا و لما یدخل الایمان فی قلوبکم“ (۴۹ : ۱۴) ۴

یہ گنوار کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، آپ کہہ دیجئے تم ہرگز ایمان نہیں لائے بلکہ تم یہ کہو کہ ہم نے اسلام کی بالا دستی قبول کی ہے کیونکہ ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اس کی تفسیر میں امام طبری لکھتے ہیں کہ ابھی تک تمہیں ایمان کی شریعتوں کا علم حاصل نہیں ہوا ہے ۳، خود قرآن مجید نے دوسری جگہ اس کی شرح میں کہا ہے:

”الاعراب اشد کفراً و نفاقاً و اجدر الا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ (۹ : ۹۷)

جاہل و گنوار کفر و نفاق میں بہت ہی سخت ہیں۔ اور ان کی حالت

اس بات کی زیادہ متقاضی ہے کہ وہ ان حدود (کی حکمتوں) کو نہ سمجھ سکیں جنہیں اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔ یعنی گنواروں کی یہ کیفیت اس لئے ہے کہ وہ رسول اللہ ؐ پر نازل ہونے والی حدود کا علم حاصل نہیں کرتے۔

ایمان کے لئے علم کو ضروری قرار دینے کے سلسلے میں سورۃ عنکبوت (نمبر ۲۹) کی پہلی آیت میں اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ محض زبان سے ایمان کا اقرار کر لینے سے انسان چھوڑ دیئے جائیں گے۔ پھر اس سورۃ کی بیالیس آیتیں عقائد و اخلاق، اعمال و افعال، اقوام و ملل کے عروج و زوال پر تبصرہ کرتی ہیں اور سابق انبیاء کے واقعات و حالات بیان کرکے فرمایا کہ: یہ تاریخی حقائق پر مبنی مثالیں ہیں، ہم انہیں لوگوں کے سمجھانے بجھانے کے لئے بیان کرتے ہیں اور ان مثالوں کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عالم ہوں۔ اس سورۃ نے انتہائی وضاحت کے ساتھ اس بات کا ثبوت فراہم کیا، کہ علم کے بغیر ایمان کی کوئی قدر نہیں اور ایمان اسی شخص کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، جو علم کی روشنی سے مستفید ہو "و ما یعقلھا الا العالمون"۔ اسی سورۃ کی آیت نمبر ۴۹، اس مضمون کی یوں وضاحت کرتی ہے: اہل علم کے لئے یہ کتاب (قرآن) تو انتہائی بین دلائل پر مشتمل ہے اور ہمارے ان واضح دلائل کا انکار سوائے ظالم (جاہل) لوگوں کے اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اس آیت میں اہل علم، اور ظالم و جاہل کو بالمقابل بیان کرکے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ قرآن پر انہیں لوگوں کا ایمان، صدق پر مبنی قرار دیا جائے گا جنہوں نے اپنے ایمان کو علم سے مضبوط کیا ہو، جاہل اور ظالم زبانی اقرار کے باوجود، قرآن کے بین دلائل سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کر سکیں گے، بلکہ الٹا ان واضح دلائل کا انکار کر دیں گے۔ سورۃ فاطر نمبر ۳۵ کی دس آیات ۱۹

تا ۲۸ علم و ایمان کے لزوم کو قطعی دلائل سے بیان کرتی ھیں اور جہالت کو ایمان کی ضد قرار دیتی ھیں ، ان آیات میں جہل اور علم کو اس طرح بیان کیا گیا ھے :

” اندھا اور بینا برابر نہیں ھو سکتے اور نہ تاریکی اور روشنی اور نہ چھاؤں اور دھوپ ، اور نہ ھی زندہ اور مردہ برابر ھو سکتے ھیں “ (شاہ رفیع الدین صاحب دھلوی نے زندہ سے مراد عالم اور اور مردہ سے مراد جاھل لی ھے)

پھر ارض و سماء ، جبال و ثمرات اور ان کے الوان و اقسام کا تذکرہ کرکے ، انسانوں ، جانوروں اور چوپایوں اور ان کے انواع و اقسام کا ذکر کیا ھے اور آخر میں فرمایا : خدا سے اس کے صرف وھی بندے ڈرتے ھیں جو اھل علم ھوں ، اس آیت میں ایک طرف ارض و سماء کی ھر قسم کی مخلوق کا بیان ھے ، دوسری طرف اس مخلوق میں سے اھل علم کا تذکرہ ھے اور تیسری طرف خشیت الٰہی کا اظہار ھے ۔ قرآن میں خشیت الٰہی ، اللہ پر ایمان کا بنیادی عنصر ھے اور اس آیت کی رو سے ارض و سماء کی تمام مخلوقات میں سے اللہ کی خشیت صرف ان انسانوں کو نصیب ھوگی جو علم و فضل کی دولت سے مالا مال ھوں گے اور جو لوگ علم سے کورے ھوں گے ان کا شمار شکل و صورت کے اعتبار سے خواہ انسانوں میں ھو یا حیوانوں میں ، جمادات میں ھو یا نباتات میں ، خشیت الٰہی سے محروم رھیں گے ۔ ” انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء “ (۳۵ : ۲۸) سورۃ زمر نمبر ۳۹ میں ، مختلف مضامین بیان کرکے پوچھا : ” قل ھل یستوی الذین یعلمون و الذین لا یعلمون “ (۳۹ : ۹) ” کہئے ، کیا علم والے اور بے علم برابر ھو سکتے ھیں ؟ “ گویا ایمان و عقائد کا معاملہ ھو یا معاشرت و معیشت کا ھر اعتبار سے انہیں لوگوں کو اھمیت

حاصل ہو گی جو اہل علم ہوں گے اور جہلاء کا نہ ایمان معتبر ہوگا ، نہ کسی دوسرے کام میں انہیں کوئی اہمیت دی جائے گی ۔ ایمان و علم کا لزوم چونکہ اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے ، اس لئے جہاں علم کو ایمان کا جزو لا ینفک قرار دیا وہاں جہل کو ایمان کی ضد ٹھرایا ۔ اور پھر اس عقیدے کی بتکرار وضاحت کی ۔ چنانچہ فرمایا : " یرفع اللہ الذین آمنوا منکم و الذین اوتوا العلم درجات " (۵۸ : ۱۱) اللہ ان لوگوں کے درجات کو بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا ، اس آیت میں ایمان و علم کو ایک ساتھ بیان کرکے ان کے لزوم کو واضح کیا گیا ہے اور اس ایمان کو درجات کی بلندی کا سبب بتایا گیا ہے جسے علم سے مضبوط کیا گیا ہو ، اسلامی نقطہ نگاہ سے اہل علم کے ایمان کا بڑا مرتبہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک آیت میں ایسے اہل علم مومنین کا مرتبہ اتنا بلند بتایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر شہادت دی تو اس شہادت میں پوری کائنات میں سے جو تین گواہ پیش ہوئے ان میں سے ایک خود اللہ ، دوسرے فرشتے اور تیسرے اہل علم تھے : شھد اللہ انه لا اله الاھو و الملئکة و اولوا العلم (۳ : ۱۸) ایمان و علم کے التزام کا یہ اہتمام تاریخ ادیان عالم میں اپنی مثال آپ ہے ۔ اس آیت میں ترتیب بیان کے اعتبار سے فرشتوں کا بیان اگرچہ اہل علم سے پہلے کیا گیا ہے لیکن دوسری جگہ اس بات کی وضاحت کر دی کہ انسان جب ایمان و علم کے زیور سے آراستہ ہوتا ہے تو اس کا درجہ فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے ۔ اس کا ثبوت ہے " و علم آدم الاسماء کلھا " (۲ : ۳۱) اور سکھائے آدم کو نام سب چیزوں کے ، جس کے بعد تمام فرشتے اس پیکر ایمان و علم کے آگے سجدہ ریز ہوگئے اور انہوں نے اعلانیہ اقرار کیا : " سبحنک لا علم لنا " اے اللہ تو پاک ہے ہمیں قطعاً علم نہیں ہے ۔

اسلام میں ایمان و علم کے لزوم کا ایک پہلو یہ بھی ہے، کہ اس نے سابق انبیاء کی تعلیمات کی تصدیق اور ان میں تلبیس حق و باطل کی تحقیق کی ذمہ داری بھی اپنے ذمے لے رکھی ہے " نزل علیك الكتاب بالحق مصدقاً لما بين يديه " (۳ : ۲) اور اس اتنی بڑی ذمے داری سے عہدہ برآ ہونا، کسی مسلمان کے لئے ممکن نہیں جب تک وہ تمام علوم و فنون سے پوری طرح واقف نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزماں کو وہ دین دے کر بھیجا جسے ادیان عالم پر غالب آنا ہے " هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق لیظهره علی الدین كله " (۶۱ : ۹) بلا شک دین اسلام کے بقیہ ادیان پر غالب آنے کا یہی مطلب ہے کہ اس دین کے ماننے والے، ان تمام علوم سے پوری طرح آگاہ ہوں جو تقابل ادیان کے لئے ضروری ہیں، احقاق حق اور قوت استدلال کی پوری صلاحیتیں رکھتے ہوں، ہر دور کے علوم و فنون اور منطق و فلسفہ سے پوری طرح واقف ہوں، ان ادیان کے ماننے والوں نے جن علوم میں اپنی بالا دستی قائم کر رکھی ہو مسلمانوں کو ان پر نہ صرف پورا عبور ہو، بلکہ دین اسلام کو ان ادیان و اقوام پر غالب کرنے کے لئے ضروری ہے، کہ مسلمانوں میں علمی برتری اور قیادت کی اعلیٰ صلاحیت بھی ہو۔ اسلام کا یہ دعویٰ، کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں " قل یاایها الناس انی رسول الله الیكم جمیعا " اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کی تصدیق امت مسلمہ اپنی ہمہ گیر قیادت انسانیت کی صلاحیت سے کرے جو اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی، جب تک کہ امت مسلمہ ہر قسم کے علوم میں کمال حاصل نہ کرے۔ اور عالم انسانیت میں اپنی صداقت و عظمت ثابت کرنے کے لئے وہی کردار ادا نہ کرے جو رسول ص مسلمانوں میں ادا کرتا ہے " لتكونوا شهداء علی الناس و یكون الرسول علیكم شهیداً " (۲ : ۱۴۳) دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

تم ''خیر امة'' ہو، تمہارا فرض منصبی یہ ہے کہ تم انسانیت کی بہتر سے بہتر کی طرف مسلسل رہنمائی کرتے ہو، انسانی فلاح و بہبود کے اصولوں کو اپنا کر معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے وہ مقام حاصل کر لو کہ پوری انسانیت کو بھلائی کا حکم دے سکو اور اسے مضر کاموں سے روک سکو ''اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنہون عن المنکر'' واضح رہے کہ ''شہداء علی الناس'' اور ''خیر امة'' جیسے عظیم رتبوں پر فائز ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر، پوری انسانیت میں ایمان و علم کے اس مقام پر فائز نہ ہوں، جس پر اصحاب رسول ص مسلمانوں میں فائز تھے۔

ایمان و علم کو لازم و ملزوم قرار دینے والے رسول ص نے علم کی ترویج کے لئے عملاً جو جو اقدامات فرمائے انہیں مختصراً بیان کیا جاتا ہے :۔ '' بلغ ما انزل الیک'' کے حکم کے تحت آپ ص نے تبلیغ کے ضمن میں تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام فرمایا۔ قرآن کریم نے '' یتلوا علیہم آیاتہ و یزکیہم و یعلمہم الکتاب والحکمة'' (جمعہ : ۱) آیت کریمہ میں رسول اللہ ص کے تین فرائض منصبی کی نشان دہی کی ہے :۔ ۱ ۔ بین دلائل کو تلاوت کے ذریعہ پیش کرنا ۲ ۔ اخلاقی تربیت اور روحانی تزکیہ کرنا ۳ ۔ کتاب و حکمة کی تعلیم دینا۔ آپ ص نے فرمایا '' بعثت معلماً'' مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے ۴ اور تاریخ شاہد ہے کہ آپ ص نے اس فریضہ کو باحسن طریق انجام دیا۔

مکی دور میں ویسے تو جس وقت اور جس جگہ بھی موقع ملتا آپ ص تبلیغ و تعلیم دین فرماتے لیکن باقاعدہ تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے سب سے پہلی جس درسگاہ کا پتہ چلتا ہے وہ '' دار ارقم'' تھا۔ جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے، وہ اس سب سے پہلی یونیورسٹی کے باقاعدہ طالب علم شمار ہوتے،

ان صحابہ کرام کو آپ ؐ خود قرآن کی تعلیم اور اخلاقی تربیت دیتے ۔ آیات قرآنی کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے آپ نے جداگانہ شعبہ کتابت قائم کر رکھا تھا ۔ بخاری کی روایت کے مطابق مدینہ میں حضرت زید بن ثابت حضور ؐ کے کاتب وحی تھے اور آپ کے ساتھ دوسرے صحابہ بھی مددگار کے طور پر کام کرتے تھے ۔ جب مدینے کے چند افراد نے اسلام قبول کیا ۔ تو آپ نے وہاں قرآنی تعلیمات کی تبلیغ و تعلیم کا ایک مرکز حضرت مصعب بن عمیر کی زیر نگرانی قائم کر دیا ۔

ہجرت مدینہ کے بعد آپ نے مسجد نبوی کے نام سے ، سب سے پہلی دنیا کی عظیم الشان اسلامی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی، اس مرکز میں انسانی ترقی کی ہر قوت و صلاحیت نشو و نما پا رہی تھی ، سرور کائنات کی ذات گرامی اس عمومی جامعہ کی روح رواں تھی ، یہاں مختلف صلاحیتوں کے طالب علم آتے اور اپنے اپنے ذوق و استعداد کے مطابق تحصیل علم کرتے تھے ۔ سید سلیمان ندوی رح نے سیرۃ النبی جلد ششم میں اس درس گاہ کا نقشہ یوں کھینچا ہے : ''کہیں ابو بکر رض و عمر رض ، عثمان رض و علی رض جیسے فرما نروا زیر تعلیم ہیں ، کہیں طلحہ رض و زبیر رض و معاویہ رض و سعد رض بن معاذ و سعد رض بن جبیر جیسے ارباب رائے و تدبیر ہیں ، کہیں خالد رض ، ابو عبیدہ رض ، سعد رض بن ابی وقاص اور عمر و بن العاص جیسے سپہ سالار ہیں ، کہیں وہ ہیں ، جو بعد کو صوبوں کے حکمران ، عدالتوں کے قاضی ، اور قانون کے مقنن بنے ، کہیں ان زہاد و عباد کا مجمع ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی ہیں ، کہیں ابو ذر رض و سلمان رض و ابو درداء رض جیسے خرقہ پوش ہیں ، جو ''مسیح اسلام'' کہلاتے تھے ، کہیں وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لا کر بیچتے اور گزارہ کرتے ، اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے ، کہیں

حضرت علی رض ، حضرت عائشہ رض ، حضرت ابن عباس رض ، حضرت ابن مسعود رض
حضرت زید بن ثابت جیسے فقیہ و محدث تھے جن کا کام علم کی خدمت اور
اشاعت تھا ،، ٦

اس درس گاہ کے مختلف شعبوں میں تربیت، اساتذہ سے متعلق ایک رہائشی شعبہ،
مسجد نبوی سے ملحق ایک چبوترہ (صفہ) سے نسبت کے باعث '' اصحاب الصفہ ،،
کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ۔ اصحاب الصفہ کی تربیت اور تعلیم قرآن و حکمت
کا اہتمام خود رسول اللہ ؐ فرماتے تھے ، بخاری کی روایت کے مطابق آپؐ نے
چار معلم اور ایک، خوشنویس مقرر فرمائے تھے ، آپ فرماتے تھے '' چار
آدمیوں سے قرآن پڑھو ، عبد اللہ رض بن مسعود ، سالم ، معاذ بن رض جبل اور
ابی رض ابن کعب ۷ ،،

مردوں کے ساتھ خواتین کی تعلیم و تربیت کو بھی برابر کی اہمیت دی
گئی تھی ، مساجد کے اجتماعات اور عیدین کے خطبات میں مسلمان خواتین شریک
ہوتیں ، غزوات و حج کے مواقع پر بھی وہ آپ ؐ سے علمی استفادہ کرتیں ، مزید
برآں آپ ؐ نے خواتین کی تعلیم و تربیت کے لئے ام المومنین حضرت عائشہ رض کی
سرکردگی میں تعلیم نسواں کا الگ پروگرام بنایا ۔ جس کا مرکز حضرت عائشہ رض
کا گھر تھا ۔ اور باقی امہات المومنین کے حجرے گویا اس کے ملحقہ شعبے تھے ۔
ام المومنین حضرت عائشہ رض نے حضور ؐ کی رہنمائی میں مدینہ اور بیرون مدینہ
سے آنے والی خواتین کی تعلیم و تربیت کے فریضے کو نہایت حسن و خوبی
سے نباہا ۔

سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلم کو ایمان کے ساتھ علم
سکھانے کی ضرورت کا اتنا احساس تھا کہ آپ صحابہ کرام کی تعلیم و تربیت

کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ غزوہ بدر کے خواندہ قیدیوں کو رہا کرنے کا فدیہ آپ ص نے یہ مقرر فرمایا کہ ہر قیدی دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔

حضور ص کی ان کوششوں کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام رض قلیل عرصہ میں علم و فضل کی دولت سے مالا مال ہو گئے اور آپ ص کو تربیت یافتہ ماہرین فن اساتذہ کو مختلف مقامات پر بھیجنے میں کبھی کمی محسوس نہ ہوئی۔ یمن میں حضرت معاذ بن جبل کی تقرری ہوئی، نجران میں عمرو رض بن حزم کو معلم بنا کر بھیجا گیا۔ اسی طرح جب قبائل قارہ و عضل مشرف بہ اسلام ہوئے تو آپ ص نے ان کی تعلیم کے لئے چھ مدرس مقرر کئے: مرشد رض بن ابی مرثد، عاصر رض بن ثابت، خبیب رض بن عدی، خالد رض بن البکیر، زید رض بن دثنہ، عبد اللہ رض بن طارق، قرآن کے ایمان و علم کے لزوم پر اصرار کا یہ اثر ہوا کہ جو قبیلہ بھی اسلام قبول کرتا فوراً علم سیکھنے کے لئے مدینہ آتا یا چند نمائندہ افراد کو مدینے بھیجا جاتا تاکہ وہ وہاں سے علم سیکھ کر اپنے قبیلے کو تعلیم دیں۔ سیر و احادیث کی کتابوں میں ایسے بےشمار واقعات ملتے ہیں۔

ہمہ گیر انسانی فلاح کے لئے رسول ص کی سنت کے مطابق "کتاب و حکمت" کو عملاً نافذ کرنے کے لئے اسلامی حکومت کو اپنے وسائل سے کام لے کر تعلیم عام کرنا چاہئے تاکہ مسلمان سچے مسلمان بنیں اور دین اسلام سابقہ ادیان کی طرح عقائد کے زبانی اقرار اور چند عادات میں محدود نہ ہو جائے۔ اسلامی حکومت پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ تعلیم کو فروغ دینے اور جہالت کا مکمل خاتمہ کرنے میں کوشاں رہے، اگر کسی اسلامی حکومت کی موجودگی میں جہالت کی روک تھام نہ کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا، کہ وہ حکومت جان بوجھ کر مسلمانوں کو کافر بنانے پر آمادہ ہے

اور قصداً مسلمانوں کو ایمان کی تکمیل سے محروم کر رہی ہے۔ جو قرآنی نقطہ نظر کے سراسر منافی ہے۔

علم کی اسی اہمیت کے پیش نظر مصارف زکواۃ میں سے ایک مصرف تعلیم قرآن، دین میں تفقہ پیدا کرنا اور قارئین کو بھیجنا تھا، حضرات معاذ رض بن جبل، ابوموسیٰ رض الاشعری، عمرو رض بن حزم وغیرھم کو جب یمن، نجران اور دوسرے اضلاع میں تعلیم دین پر متعین کیا گیا تو یہ حضرات اپنے اپنے علاقوں میں تعلیمی اخراجات زکواۃ ھی سے پورے کرتے تھے، ابن جوزی نے سیرۃ العمرین میں بیان کیا ھے، کہ حضرت عمر رض نے معلمین کے لئے باقاعدہ ماہوار تنخواہ مقرر کر رکھی تھی۔ مصارف زکواۃ میں " فی سبیل اللہ " کے تحت تعلیم کو اولیت حاصل ھوتی تھی، اسلام نے ایک طرف علم کو ایمان کے ساتھ لازم قرار دیا اور دوسری طرف علم کی نشر و اشاعت کے لئے مخصوص فنڈ سہیا کر کے اس کی عظمت و اہمیت کو انتہا تک پہنچا دیا۔ یہ اس لئے کہ دراصل علم و ادراک اور ذھنی شعور سے کام لینے والا انسان ھی حیوانات و حشرات پر ترجیح حاصل کرتا ھے۔ اور اسی سے یہ توقع کی جا سکتی ھے کہ وہ مصلحت عامہ کے نصب العین کو ملحوظ رکھ کر قافلہ انسانیت کو آگے بڑھتے رہنے میں مدد دے گا۔

تعلیم کا مقصد اولین انسان کی تمام خداداد صلاحیتوں کی تربیت اور اس کے پوشیدہ و ظاھری قویٰ کو نشو و نما دینا ھے۔ اور یہی مقصد " فریضۃ من اللہ " کے تحت حکومت اسلامیہ کے فرائض منصبی میں داخل ھے کہ وہ ملک کے ہر فرد کی ظاھری و باطنی صلاحیتوں کی تربیت کا بہتر سے بہتر اہتمام کرے اور ہر فرد کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ملک و ملت کی خدمات انجام دے، جو حکومت اپنی رعیت کی صلاحیتوں کی

تربیت نہیں کرتی، وہ دراصل پوری قوم کو اپاہج بنانے کے جرم کا ارتکاب کرتی ہے۔

مسلمانوں کو کفر کے مقابلے میں ہر طرح سے تیار رہنے کا حکم دیا گیا ہے:

" و اعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل ترهبون به عدو الله و عدوكم و اخرين من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم " (۸:۶۰)

یعنی اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر قسم کی افرادی، علمی و معنوی، صنعتی و سائینسی و دفاعی، اقتصادی و سیاسی قوت سے کام لے کر اللہ کے دشمنوں اور خود اپنے ان دشمنوں کا مقابلہ کرو، جن کے ساتھ تمہارا براہ راست تصادم ہے اور ان دشمنوں کے لئے بھی تیاری کرو جنہیں تم نہیں جانتے لیکن اللہ جانتا ہے۔ "من قوة" ہر قسم کی قوت کے لئے عام ہے۔ اور "رباط الخيل" سے سرحدوں کا دفاع مراد ہے، کسی قوم کا اصل سرچشمہ قوت اس کے افراد ہوتے ہیں، اور تعمیر افراد میں تعلیم کو جو مقام حاصل ہے اس کا مقابلہ کوئی دوسری قوت نہیں کر سکتی۔ تعلیم ہی اُس نظریہ حیات کو مجاہد کے قلب و دماغ میں راسخ کرتی ہے جس کی خاطر وہ میدان جنگ میں اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلتا، اور جس نظریہ حیات سے مست ہو کر وہ کارھائے نمایاں انجام دیتا ہے۔ سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و سلم کے جانثاروں میں جہاد کا جذبہ اسی تعلیم کا مرہون منت تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ فرد کی تربیت کا مرکزی نقطہ، اسلامی نظریہ حیات سے واقفیت تھا۔ اسی معنوی قوت سے وہ محیر العقول کارنامے انجام دیتا تھا۔ "فلم تقتلوهم و لكن الله قتلهم و ما رميت اذ رميت و لكن الله رمىٰ" (۸:۱۷) تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا ہے، جب آپ نے تیر پھینکا تھا تو آپ نے

نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا تھا۔ اس آیت میں اسی قوت کی طرف اشارہ ہے۔ معلوم ہوا کہ جب کسی قوم کو اس کے نظریہ حیات کی پوری طرح تعلیم دے دی جاتی ہے تو اس کا ہر فرد اپنے نظریہ حیات پر ایمان کامل پیدا کر لیتا ہے۔ ایسے مومن افراد اگر تھوڑے بھی ہوں تو انہیں مغلوب نہیں کیا جا سکتا " کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة " (۲ : ۲۴۹) اس کے برخلاف معنوی قوت سے عاری قوم، لاتعداد فوج اور اسلحہ کی کثرت کے باوجود، مغلوب ہو جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ان میں وحدت فکر نہیں ہوتی " تحسبهم جميعا و قلوبهم شتى" (۵۹ : ۱۴) آپ انہیں متحد سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں۔ سب سے پہلی وحی" اقرأ " کی روشنی میں حضورؐ نے ہر فرد کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپؐ کے نصاب تعلیم سے آراستہ افراد جب بھی میدان کار زار میں پہنچے تو تعداد کی قلت اور اسلحہ حرب میں مد مقابل سے کم ہونے کے باوجود صرف ایمان و علم کی معنوی طاقت سے انہوں نے وہ کارنامہ انجام دیا جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اسلام میں دفاع کے لئے اسلحہ سازی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن قرآنی نقطہ نظر سے یہ معنوی قوت کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ " رباط الخيل " کو " من قوة " کے بعد رکھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس صریح حکم کے بعد، کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے خلاف ہر قسم کی پوری قوت تیار رکھیں اور یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ اصل تیاری اسلامی نظریہ حیات کا فروغ اور اس کا ابلاغ عامہ ہے، اگر مسلمان قوم اپنے افراد کو جاہل رکھتی اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کرتی اور ایسی تعلیم کو رواج نہیں دیتی جو روح کو بالیدگی بخشے، باطن کے اسرار کھولے، اور قرآن کے حقائق کو عام کر دے، تو ایسی قوم کے سر براہ

اللہ کی نظر میں مجرم ہیں، جنہیں نہ قوم معاف کرے گی نہ اللہ تعالیٰ۔ قوم کو دشمن کے مقابلہ میں تیار کرنے کی جو ترتیب اللہ رب العزت نے بیان کی ہے اس کو الٹنا اور مادی قوت کو معنوی قوت پر ترجیح دینا، اسلام سے کفر کی طرف رجوع کرنے کے مترادف ہے۔ جو نظام مسلمانوں کو اس حالت میں رکھے کہ خود مسلمان اپنی جہالت اور عدم تربیت کی وجہ سے دشمنوں سے خوف کھائیں وہ نظام دشمنوں کا نمائندہ اور دوست کے لبادہ میں دشمن کا کام کر رہا ہے ایسے دوست نما دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچانا مسلمانوں کا فرض ہے۔

تعلیم، قوم کی حیات ہے اور جہالت اس کی موت ہے، جو حکومت یا معاشرۃ اپنی رعایا یا افراد کو تعلیم سے دور رکھے وہ دراصل قتل کا ارتکاب کرتا ہے۔ قتل کے دو طریقے ہیں۔ ایک باقاعدہ کسی ہتھیار کے ذریعہ اور دوسرے ایسے اسباب پیدا کر کے جو کسی فرد کے قتل و موت کا باعث بن جائیں، کسی شخص کا بازو کاٹ کر تن سے جدا کرنا یا اسے بےخبر رکھ کر اس کی صلاحیت کو بےکار کر دینا، نتیجہ کے اعتبار سے دونوں ایک ہی طرح کے جرم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں تمام تعمیری صلاحیتیں پیدا کی ہیں، لیکن ان کی نشو و نما اور تربیت، معاشرے اور حکومت کا فرض ہے۔ اگر کوئی معاشرہ اور نظام، انسانیت کے جوہر کی تربیت نہیں کرتا، اور انہیں اسی ابتدائی حالت میں چھوڑے رکھتا ہے تو وہ ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، اور انسان کو جو احسن تقویم میں پیدا ہوا ہے اسفل السافلین کی طرف گرانے لگتا ہے۔

" علم کا نور" اور " علم کی روشنی" اکثر بطور استعارہ استعمال ہوتے رہے ہیں، لیکن دور جدید میں یہ باتیں استعارہ نہیں، حقیقت بن چکی ہیں۔ اس لئے دور حاضر میں کسی قوم کو جاہل رکھنا پوری قوم کو تاریکی

میں بند رکھنا ، ان کی لفظی و معنوی تمام صلاحیتوں کو ضائع کر دینا ، نیز ان کی آنکھوں کے نور اور کانوں کی سماعت پر ڈاکہ ڈالنا ہے۔

یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ قوم کی جہالت کی ذمے داری خود قوم پر ڈال دی جائے اور اقتصادی و معاشی نظام کے ذمہ دار، اس کی ذمے داری سے کنارہ کش رہیں۔ یہ انسانیت کے ساتھ کھلا مذاق ہی نہیں بلکہ اس پر ظلم کی قبیح ترین صورت بھی ہے۔ کسی ماں کا یہ عذر تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے بچے کا گلا نہیں دبایا بلکہ بچہ خود بخود اس لئے مر گیا کہ اسے کھانے کو کچھ نہیں دیا گیا ، بیماری میں اس کا علاج نہ ہو سکا اور موسم کی سختیوں سے اسے بچایا نہ جا سکا، جس طرح ایک ماں اگر اپنی جملہ ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہ ہو تو باوجود گلا نہ گھونٹنے کے قتل کی مرتکب ہے ، اسی طرح حکومت یا معاشرہ پوری قوم کی جہالت اور اپاہج پن کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب کسی جوہر کی صحیح تربیت کر کے اسے اس کام پر نہ لگایا جائے جس کے لئے خالق نے اسے پیدا کیا تھا ، تو یقیناً اس جوہر میں تعمیر کی بجائے تخریب پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان جو بنیادی طور پر تعمیری صلاحیتیں لے کر دنیا میں آتا ہے ، اسے تخریب پر ڈالنے کی ذمہ داری نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ قوم کے ساتھ منفی رویہ اختیار کرنے سے کوئی نظام یہ کہکر بری الذمہ نہیں ہو سکتا کہ اس نے تو قوم کو جرائم پیشہ نہیں بنایا ، جب کہ اس نے اسے جاھل اور غیر تربیت یافتہ رکھ کر جرائم کا عادی بنایا ہو۔ حضرت عمر رض نے چوری کرنے والے غلاموں کے ہاتھ کاٹنے کی بجائے ظالم آقا سے کہا تھا کہ اگر آئندہ انہوں نے چوری کی تو ان کی بجائے تمہارا ہاتھ کاٹونگا۔

قرآن حکیم علم و فضل اور عقل و فکر سے کام نہ لینے والے انسانوں کو

" شر الدواب " بدترین قسم کے حیوان کہتا ہے " ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون (۸ : ۲۲) اللہ تعالیٰ کے نزدیک زمین پر چلنے والے جانوروں میں سب سے بدتر حیوان وہ انسان ہیں، جو بہرے اور اندھے ہیں اور جنہیں عقل و فکر سے کام لینا نہیں آتا۔ عقل و فکر سے عاری انسان، حیوان سے بھی نچلی سطح پر اس لئے گر جاتا ہے کہ انسان کے پاس پیدائشی طور پر عقل و فکر کا جوہر موجود ہوتا ہے، لیکن جب عقل و فکر کے جوہر کو تعلیم و تربیت کے ذریعے جلا نہیں دی جاتی۔تو اس کی وہی ذہانت رذیل حرکات کی طرف مڑ جاتی ہے ایسے انسان کا مقابلہ حیوانوں سے ہو تو اخلاقی پستی اور تخریبی قوت میں وہ حیوانات سے آگے نکل جاتا ہے۔ انسان کو " شر الدواب " کی سطح پر گرانے والا دراصل وہ نظام حکومت یا معاشرہ ہے جس پر بحیثیت مجموعی انسانوں کی عقل و فکر کو تربیت دے کر انہیں احسن تقویم پر قائم رکھنے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

قرآن حکیم جہالت کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ لوگ جنہیں، علم و فن کی سہولتیں میسر ہونے کے باوجود علم سے محروم رکھا جاتا ہے، آنکھیں ہونے کے باوجود انہیں دیکھنے کی تربیت نہیں دی جاتی، اور کان ہونے کے باوجود ان کی سماعت کو غیر تربیت یافتہ چھوڑ دیا جاتا ہے، قرآن مجید انہیں حیوانوں سے زیادہ گمراہ قرار دیتا ہے " ام تحسب ان اکثرھم یسمعون او یعقلون ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا (۲۵ : ۴۴) کیا آپ کا خیال ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں، وہ تو محض چوپائے ہیں، نہیں نہیں وہ تو ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ دوسری آیت میں " شر الدواب " کو کافر قرار دیا اور بتایا کہ جاھل کی جہالت اور علم و فضل سے دوری، اسے ایمان جیسی نعمت تک نہیں پہنچنے دیتی " ان شر الدواب عند اللہ الذین

کفروا فھم لا یومنون‘‘ (۸:۵۵) اس کے نزدیک بد ترین حیوانوں میں سے وہ انسان ھیں جن کی جہالت انہیں صحیح تعلیمات اسلامی تک پہنچنے نہیں دیتی اور وہ کفر کی تاریکی میں پڑے رہتے ھیں، اس لئے وہ ایمان لانے سے قاصر رہتے ھیں۔ ایک موقع پر فرمایا : ’’ کذلك انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء‘‘ (۳۵ : ۲۸) اس کی رو سے خوف خدا اور اصل انسانیت صرف انہیں لوگوں کو میسر ھے، جو علم و فضل والے ھوں۔ قرآن حکیم نے جاھل مجرمین کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ھے ’’ لھم قلوب لا یفقھون بھا ‘‘ (۷ : ۱۷۸) ان کے سینوں میں دل تو ھیں، لیکن انہیں چونکہ سوچ بچار اور افہام و تفہیم کی صلاحیت سے محروم کر دیا گیا ھے، اس لئے وہ ان سے سمجھ کا کام نہیں لے سکتے ’’ افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا او آذان یسمعون بھا فانھا لاتعمی الابصار و لکن تعمی القلوب التی فی الصدور‘‘ (۲۲ : ۴۶) کیا ان لوگوں نے دنیا کی سیاحت نہیں کی کہ انہیں عقل و فکر سے کام لینے والے قلوب اور سننے والے کان نصیب ھوتے، حقیقت یہ ھے کہ ان کی آنکھیں تو اندھی نہیں ھوتیں لیکن وہ ان کے دل اندھے ھو جاتے ھیں، جو سینوں میں ھیں، یعنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ھو جاتے ھیں’’ اولئك الذین لعنھم اللہ فاصمھم و اعمیٰ ابصارھم (۴۷ : ۲۳) یہی لوگ ملعون ھیں جنہیں جسمانی کانوں کے باوجود معنوی سماعت سے محروم کر دیا گیا ھے اور جن کی ظاھری آنکھیں ھونے کے باوجود ان سے معنوی اور حقیقی بصارت چھین لی گئی ھے۔

اس دور میں جب کہ غیر مسلم اقوام صحیح معنوں میں سیاروں پر کمندیں ڈال رھی ھیں۔ اور چاند اور دوسرے سیاروں کو مسخر کرنے میں زبردست کامیابیاں حاصل کر چکی ھیں۔ مسلم دنیا تاریکی و جہالت میں بھٹک رھی ھے۔ مغرب نے معاشرتی، سائنسی اور تکنیکی علوم میں دسترس، اور قومی صلاحیتوں

کی تربیت سے محیر العقول ترقی حاصل کر لی ہے لیکن وہ قوم جسے کفار کو خائف کرنے کا حکم دیا گیا تھا ، ڈری سہمی اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے دشمنوں سے حیات و اس کی بھیک مانگتی پھر رہی ہے غیر مسلم اقوام نے اپنے افراد کی اکثریت کو تعلیمیافتہ کر کے جو مقام حاصل کیا وہ اس بات پر گواہ ہے کہ انسان کی ظاہری و باطنی صلاحیتوں کی نشو و نما اسے تسخیر کائنات کے مرتبہ پر فائز کر دیتی ہے۔

اسلامی ممالک کے ذمے دار لوگ اپنے حلقہ میں جہالت باقی رکھ کر غیر مسلم ممالک کی نسبت زیادہ بڑے جرم کے مرتکب ہیں ، کیونکہ مسلمان قوم کو تعلیم کی طرف توجہ اس لئے بھی ضروری تھی کہ اس کے ذریعہ خالق و مالک کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ سب سے پہلی وحی میں علم و عرفان کے حصول کا حکم دیا گیا ہے ، خود رسول اللہ ص نے نبوت کے بعد سے اپنی زندگی کے آخری سانس تک مسلسل تئیس ۲۳ برس ، دنیا کی امی قوم کو زیور علم سے آراستہ کرنے کے لئے ایسے بےشمار طریقے اپنائے جن کی مثال آج بیسویں صدی کے ربع آخر میں بھی کوئی قوم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بدر کے پڑھے لکھے جنگی قیدیوں سے آپ ص کا سلوک اور انہیں مسلمان بچوں کو تعلیم دینے پر مامور کرنا مجرد علم کی عظمت کا ثبوت ہے کیونکہ یہ قیدی اللہ ، رسول ص اور مسلمانوں کے جانی دشمن تھے اور اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لئے مدینہ پر چڑھ آئے تھے ، آپ کا عمل بتا رہا ہے کہ علم جہاں بھی ہو روشنی ہے اور عالم بہرحال قابل احترام ہے اور اس کی علمی صلاحیت سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے۔

رسول اکرم صلعم کا یہ اسوۂ حسنہ ہے جو آپ نے مسلمان بچوں کو زیور علم سے آراستہ کرنے کی خاطر پیش فرمایا ، قرآن ، تفسیر ، حدیث ، لغت ، ادب ، تاریخ اور دوسرے فنون کی کتب کا مطالعہ یہ بات واضح کر دے گا کہ

رسول اکرم صلعم کے نزدیک علم کے حصول کی کتنی اہمیت تھی۔ اور آپ نے کس طرح صحابہ کرام کو غیر اقوام کی زبانیں اور دیگر علوم و فنون حاصل کرنے کے لئے ترغیب دلائی اور اس کے لئے عملی اقدام فرمایا۔

اب تعلیم، زندگی کی بنیادی ضروریات میں داخل ہوچکی ہے۔ زراعت آج سے کچھ عرصہ قبل روایتی طرز پر کی جاتی تھی اور اس کے لئے کسی سند یا ڈگری کی ضرورت نہ تھی۔ اب اس کی وہ کیفیت باقی نہیں رہی۔ سائینسی اور تکنیکی ایجادات نے زراعت میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے کسان کو بھی تعلیم حاصل کئے بغیر اس انقلاب کا ساتھ دینا مشکل ہے۔ دوسرا بڑا عامل یہ ہے کہ سائینسی اور تکنیکی علوم نے زراعت کی وہ اجارہ داری ختم کر دی ہے، جو آج سے کچھ عرصہ قبل اسے سب سے بڑے روز گار کی حیثیت سے حاصل تھی۔ جدید صنعتی انقلاب نے زراعت کی اس حیثیت کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ اور اب صنعت، روزگار کی حیثیت سے اگر زراعت کے برابر نہیں تو کم ازکم زراعت کے بعد اسی کا مقام ہے۔ روز گار کے اتنے بڑے ذریعے کے لئے تعلیم ناگزیر ہوگئی ہے۔ جس طرح آج کا کسان تعلیم کے حصول کے بغیر زراعت میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا، اسی طرح آج کا مزدور بھی سائینسی اور تکنیکی علوم حاصل کئے بغیر مشینی و صنعتی میدان میں کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ زراعت و صنعت وہ بنیادی ادارے ہیں جو روز اول سے انسانیت کو روز گار مہیا کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن دور جدید نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ آج کی ایجاد کل کے معمولات میں سے معلوم ہونے لگتی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے چاند کا سفر معجزات میں سے شمار ہوتا تھا۔ لیکن جب ۱۹۶۹ء میں وہی کارنامہ انجام دیا جا رہا تھا تو دنیا بھر کے لوگ اس کی ایک ایک لمحے کی خبریں سن کر حیران ہو

رہے تھے۔ بعد میں اسی سفر پر جب خلانورد حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے لاہور سے پنڈی جاتے ہوئے گاڑی میں کوئی معمولی خرابی پیدا ہو گئی ہو۔ علوم و فنون میں ترقی کی یہ برق رفتاری اس بات کی متقاضی ہے کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں علوم و فنون کے مراکز اس کثرت سے قائم ہوں کہ لوگ روز افزوں ایجادات و ترقیات سے پوری طرح واقف رہیں اور پھر اپنے علم و تجربہ کی بنا پر ان میں اضافہ کرتے جائیں، لیکن شومئ قسمت دیکھئے کہ جس قوم کی تعلیم و تدریس کا آغاز ''اقرأ'' کی وحی الٰہی نے کیا تھا، دور جدید کے معاشرتی و طبیعیاتی علوم کے مقابلے میں بالکل اپاہج ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کا حامل و مبلغ، خود جہالت کی اتھاہ گہرائیوں میں پڑا ہوا، اپنے آپ کو سب سے بڑا معلم خیال کرتا ہے۔ خود تو لاعلاج بیماریوں میں مبتلا ہے، لیکن پوری انسانیت کو بیمار قرار دے کر ان کا معالج بننے کا دعویدار ہے۔

اس تباہ کن صورت حال کی سب سے بڑی ذمے داری مسلمانوں کے موجودہ اقتصادی و معاشی نظام پر عائد ہوتی ہے جس میں دنیا کے سب نظاموں کی برائیاں تو موجود ہیں لیکن سرمایہ داری، اشتراکیت اور کمیونزم کی خوبیوں میں سے کوئی اچھا عنصر اس میں شامل نہیں۔ اس نظام کا منشائے اولین یہ ہے کہ مسلمان جاہل رہیں تاکہ دین اور مذہب کے نام سے ان کا استحصال کیا جاسکے، اسلام دنیا میں ظلم ختم کر کے عدل قائم کرنے کا پیغام لایا تھا، لیکن یہ پیغام اسی صورت میں عام ہو سکتا ہے، جب مسلمانوں کو اپنے دین کی صحیح تعلیمات کا علم ہو، وہ اللہ رب العزت کی ہدایات سے متعارف اور نبی اکرم صلعم کی سنت سے پوری طرح آگاہ ہوں، مگر موجودہ معاشی نظام کے ذمے داروں کے لئے یہ صورت حال بڑی ہی تباہ کن ہے اس طرح عامۃ المسلمین کو تعلیم یافتہ بنا کر گویا ظالم خود اپنی موت کے وثیقے پر دستخط کرے گا، بالفاظ دیگر

ظلم، بے انصافی اور استحصال کا خاتمہ خود اس نظام کے ذمہ داروں کا خاتمہ ہے، یہی وجہ ہے کہ موجودہ معاشی نظام کو باقی رکھنے والے اس دور جدید میں جب کہ علوم و فنون کا سیلاب آیا ہوا ہے، مسلمانوں کے گرد جہالت کا مستحکم حصار بنانے کی جد و جہد میں مصروف ہیں، تاکہ علم کسی طرح ان تک نہ پہنچ سکے۔ اس نظام کے ذمہ دار افراد کی ذہانت کی داد دیجئے کہ انہوں نے چن چن کر ذرائع ابلاغ سے ایسے پروگراموں کو خارج کر دیا ہے جن سے جاہلوں کو علم، اور بے خبروں کو معرفت حاصل ہو۔

اس نظام کے ذمہ داروں کی اسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ عوام کی بھلائی کے کام آنے والی ہر ایجاد پر اس طرح اجارہ داری قائم کر دی جائے کہ عامۃ المسلمین اس سے کسی طرح بھی مستفید نہ ہو سکیں، تعلیم کے لئے دور حاضر کی سب سے عمدہ و مفید ایجاد ٹیلیویژن ہے، ہمارے ملک میں اسے لانے کے لئے یہی دلیل دی گئی تھی کہ یہ تعلیم و تدریس کا سب سے اچھا اور مؤثر ذریعہ ہے۔ لیکن افسوس دیہات سے آخری پیسہ تک آبیانے اور دوسرے ٹیکسوں کے نام پر وصول کرنے کے باوجود دیہات میں پھیلے ہوئے کروڑوں جاہل غلاموں کو ٹیلیویژن کی تعلیمی افادیت سے کوئی حصہ نہیں دیا گیا، ضروری ہے کہ ٹیلیویژن کے استعمال میں دیہاتیوں کا خاص لحاظ رکھا جائے اور دیہات کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے نیز ان پڑھ دیہاتیوں کو ٹیلیویژن کے ذریعے دور جدید کی مفید معلومات و ایجادات سے روشناس کرانے کے لئے، ہر گاؤں میں ٹیلیویژن کے متعدد سیٹ مہیا کئے جائیں، اگر ٹیلیویژن واقعی ایک تعلیمی ضرورت ہے تو اس سے ناخواندہ دیہاتیوں کو کیوں محروم رکھا گیا ہے؟

موجودہ اقتصادی و معاشی نظام کا تقاضا یہ ہے کہ صرف شہری اقلیت ہی تعلیمی سہولتوں سے مستفید ہو، دنیا کے تمام علوم کا تجربہ صرف شہروں

میں کیا جائے۔ ظلم کی انتہا ہے کہ شہر میں تعلیمی سیلاب آیا ہوا ہے، اور دیہات زمانہ قبل از تاریخ کی طرح جہالت میں ڈوبا ہوا ہے۔ شہر میں تعلیم کے لئے میونسپل کمیٹیوں، کارپوریشنوں، کنٹونمنٹوں، انجمنوں اور گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں کی بھرمار ہے، کیڈٹ کالج، ٹریننگ سنٹر، انجینئرنگ، میڈیکل اور قانون کے مراکز ہیں۔ عام تعلیم کی منصوبہ بندی ہو، یا سائینسی اور تکنیکی تعلیم کی پلاننگ، طبی و فنی علوم کی بات ہو یا ٹریننگ اور تربیت کے مراکز کی سوچ بچار، ہر اعتبار سے شہر کو اولیت حاصل ہے۔ گویا موجودہ اقتصادی و معاشی نظام کے کارکنان نے ملک کی اقتصادیات اور معاشیات پر اجارہ داری قائم کرکے منصوبہ بندی کرنے والوں کے لئے یہ لازمی قرار دے دیا ہے کہ صرف شہریوں کو تعلیم اور علوم و فنون کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور ملکی وسائل کی کمی کو دیہاتیوں کی پسماندگی کا سبب بتا کر کروڑھا انسانوں کو قصداً جاهل اور ان پڑھ رکھا جائے۔ کسے معلوم کہ یہ محروم و مظلوم اکثریت اپنی محرومی و مظلومیت کا احساس کر لینے کے بعد بیسویں صدی کے ربع آخر میں اپنے انتقام کے لئے کیا صورت اختیار کرے اور محمد رسول الله ص کی امت کے سواد اعظم کو جاہل اور ان پڑھ رکھنے والے نظام کے ذمے داروں کے خلاف کیا قدم اٹھائے۔

سائینس اور ٹیکنالوجی کے اس عہد میں مسلمانوں کی ترقی کے لئے لازمی ہے کہ دیہات کو پوری توجہ سے تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے وسیع پیمانہ پر عام اور فنی و تکنیکی تعلیم کا رخ دیہات کی طرف موڑ دیا جائے تاکہ تعلیم کتاب و حکمت کی اس سنت کا احیاء ہو جس کے لئے رسول الله ص مبعوث ہوئے تھے۔ جب تک اسلامی حکومت ملک کے، ہر فرد کو تعلیمیافتہ نہیں بنا لیتی الله کا حکم ''بلغ ما انزل الیك'' اپنی تکمیل کا مسلسل تقاضا کرتا

رہے گا، دیہات کا ذہن تازہ، قویٰ مضبوط اور صلاحیتیں لا محدود ہیں۔ اس میں کام کی لگن، محنت و مشقت کی عادت، تعمیر و ترقی کی طرف رغبت اور راست اقدام کی تڑپ موجود ہے۔ اس کی صلاحیتیں جدید افکار و خیالات سے جلا چاہتی ہیں۔ ایک ملک گیر تعلیمی پروگرام کے تحت دیہات کو سدھارنے اور ترقی دینے کا تہیہ کر لیا جائے تو اس کی صلاحیتیں ملکی تعمیر کے کام آسکتی ہیں۔ اس وقت نہ صرف مسلمان ممالک بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ کی تعمیر و ترقی کا راز دیہات کی ترقی و تعلیم میں پوشیدہ ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے جن ممالک نے اس راز کو پا لیا ہے، انہوں نے یورپ و امریکہ کو چند سالوں میں جا لیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انجینیئر، ڈاکٹر، پروفیسر، فوج اور سول کی اعلیٰ ملازمتوں کے لئے مقابلے کے امتحانات جس طرح شہریوں کے لئے عام ہیں اسی طرح دیہاتیوں کے لئے بھی ہیں۔ ہر وہ شخص جو ایک خاص تعلیمی لیاقت رکھتا ہو اسے ایسے استحانات میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے، اور اس میں دیہاتی یا شہری کی کوئی تفریق نہیں۔ یہ بات بظاہر جتنی خوبصورت اور عدل و انصاف پر مبنی نظر آتی ہے بباطن اتنی ہی مکروہ اور ظلم و بدیانتی پر مبنی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ایسے امتحانات کے لئے ایک خاص غیر ملکی زبان لازمی ہے، جس میں دسترس حاصل کرنا، ایک طبقے کے لئے مخصوص ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جو خاص تعلیمی لیاقت ایسے امتحانات کے لئے ضروری ہے، اس کے لئے شہری اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے اس مقصد کے لئے قائم شدہ انگلش میڈیم اسکولوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی ضرورت پوری کر لیتے ہیں۔ کسی دیہاتی میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ اپنے بچے کو ایسے اداروں میں تعلیم دلوا سکے۔ ظاہر ہے کہ جو بچہ کے۔جی (K.G.) سے لے کر بی۔اے (B.A.) تک، اس امتحان کے لئے موزوں ماحول میں

تربیت پاتا ہے اس کے مقابلہ میں کسی دیہات کے ناتجربہ کار اساتذہ کے زیر تربیت ناسازگار حالات میں ابتدائی تعلیم پانے والے بچے کیونکر سبقت لے جا سکتے ہیں۔

ضروری ہے کہ دیہات اور شہر کے بچوں کو یکساں سہولتیں میسر ہوں۔ ایک جیسا ماحول دستیاب ہو، تعلیم و تربیت کا یکساں معیار ہو، امتیازی زبان ختم کر دی جائے۔ قومی اور ملکی زبانیں مقابلے کے امتحانات کی زبانیں قرار پائیں۔

موجودہ حالات میں جہالت کے مسئلے کو ہنگامی صورت حال کے تحت حل کرنے کی کوشش کی جائے اور نظام زکواۃ کے تحت اس مسئلہ کو دیہات سے حل کرنا شروع کیا جائے جہاں اس کا گڑھ ہے۔ ہر علاقے کی زکواۃ جمع ہو کر اسی علاقے پر خرچ ہو، اور نظام زکواۃ کے تحت ملکی معیشت کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ دولت کی تقسیم دیہات و شہر میں مساوی ہو، دیہات کی دولت، دیہات میں رہے، تو کسی بھی فن کا ماہر دیہات میں خدمت کرنے کو عار نہ سمجھے گا۔ دیہاتی اپنی دولت دیہات کی تعمیر و ترقی میں لگائیں گے، اور نتیجۃً تعلیم و تربیت کا ایک سنہرا اور تابناک دور شروع ہوگا، وہاں کا بچہ بچہ تعلیم حاصل کرے گا اور آسودگی کے باعث خوشگوار تعلیمی ماحول پیدا ہو جائے گا۔ اچھے اساتذہ کی خدمات حاصل کی جا سکیں گی۔ زکواۃ فنڈ سے تعلیمی اداروں کی عمارتیں تعمیر کی جا سکیں گی۔ بیکاری اور معاشی غلامی کے انسداد کی وجہ سے ہر شخص فارغ البال ہو کر تعلیم و تربیت پر زیادہ سے زیادہ توجہ دے سکے گا۔ اسے اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے دور بھیجنے کا بھی خطرہ نہ رہے گا۔ اور دیہات کی پوری آبادی ملک کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہو جائے گی۔

جہالت کے انسداد کی بحث ختم کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ نصاب تعلیم کا تذکرہ بھی کر دیا جائے کیونکہ اسی کے مطابق تعلیم کے نتائج نکلیں گے۔

اس وقت ملک میں دو قسم کے نظام تعلیم رائج ہیں۔ (۱) جدید نظام تعلیم، جو سرکاری سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نافذ ہے (۲) قدیم مذہبی نظام تعلیم، جو عربی مدارس میں رائج ہے۔

جدید نظام تعلیم کا مقصد ملک میں ایسے افراد پیدا کرنا ہے جو برطانوی سامراج و استعمار کے سچے جانشین کی حیثیت سے اپنے انگریز آقاؤں کی روایات کی سختی سے حفاظت و نگہداشت کر سکیں، ملکی مفاد اور اسلامی اقدار کے احیاء اور ان کی مقبولیت کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو سکیں۔ البتہ بالواسطہ اس نظام تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ کو ان جدید معاشرتی اور سائینسی علوم سے روشناس کرائے، جنہیں مغرب نے اپنے جدید مسائل حل کرنے کے لئے اپنے تعلیمی اداروں میں رائج کر رکھا ہے۔

قدیم مذہبی نظام تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو زمانۂ وسطیٰ کے اس نصاب تعلیم کو پڑھائیں جو زوال بغداد سے پہلے کے مسائل حل کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا، سقوط بغداد کے بعد مسلم ممالک کے حالات میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہو گئی تھی بدلے ہوئے حالات کا تقاضا تھا کہ نصاب تعلیم کو از سرنو مرتب کیا جاتا، لیکن چونکہ بدقسمتی سے مسلمانوں کے فکری انحطاط کی وجہ سے ان کا سیاسی زوال وقوع پذیر ہوا تھا، اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ مسئلے کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ سکتے، چنانچہ وہ نصاب تعلیم کو نئے تقاضوں کے مطابق ترتیب دینے میں نا کام رہے۔ حالات

کا تقاضا تھا کہ نصاب تعلیم میں ایسے مضامین اور علوم کا اضافہ کیا جاتا جنہیں حالات نے نئے تقاضوں کے مطابق جنم دیا تھا، اور ان مضامین کو خارج کر دیا جاتا جو اپنی معنویت و افادیت کھو چکے تھے۔ اسی تاریخی نقطے سے مسلمانوں کے فکری ارتقاء میں جمود پیدا ہونے لگا اور بہت سے وہ علوم جنہیں سلف غیر اسلامی قرار دے چکے تھے، مثلاً یونانی فلسفہ و منطق وغیرہ اور بعد میں حالات کے دباؤ کے تحت نصاب میں داخل کئے گئے تھے، اب عین اسلامی علوم قرار پا گئے، اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کے تقدس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان علوم میں کسی قسم کا تغیر و تبدل خود اسلام میں تغیر و تبدل کے مترادف سمجھا جانے لگا۔

اگرچہ تاریخی قوتوں نے مسلمانوں کے ذہنی و فکری ارتقاء کو روک دیا اور ان کا نصاب تعلیم حالات کی مناسبت سے مکمل تعطل کا شکار ہوگیا، لیکن دوسری طرف حالات نت نئے مسائل پیدا کرتے چلے گئے اور مسلمانوں کا نصاب تعلیم اسی تناسب سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ جدید تقاضوں کے مطابق جدت و ندرت پیدا ہونے کے بجائے نصاب میں قدامت اور رجعت بڑھتی چلی گئی۔ اسی دوران مغرب نے ایک نئی طرز حیات کی بنیاد رکھی، جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نئی حالات و مسائل کے حل کے لئے جدید افکار ابھریں۔ مغرب اپنی سیاسی و اقتصادی برتری کے ساتھ اپنے مسائل اور ان کے حل مسلمان ممالک میں لایا، اور مسلمانوں کا اپنا نصاب تعلیم عملاً معطل اور حکومت کی بجائے پرائیویٹ معاملہ بن کر رہ گیا۔ چنانچہ آج ہمارے ہاں دوہرا نظام تعلیم مذکورہ حالات کی پیداوار ہے۔

اس وقت یہ دونوں نظام تعلیم ہمارے ہاں رائج ہیں اور دونوں عوام کے سرمایہ سے چل رہے ہیں۔ حکومت عوام سے انکم ٹیکس کے نام پر رقوم جمع

کرتی ہے ، اور علماء زکواۃ (مذہبی ٹیکس) کے نام پر ، عوام دونوں ٹیکس دینے پر مجبور ہیں۔ حکومت کی وصولی کے پیچھے پولیس اور فوج کی طاقت ہے۔ جب کہ علماء کی وصولی کے پیچھے مذہب کی طاقت موجود ہے۔ تعلیم کے نام پر دوہرے ٹیکس کا نظام عوام الناس کے لئے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ اور شاید مستقبل قریب میں ان کے لئے دونوں ٹیکسوں کے ساتھ وفادار رہنا مشکل ہو جائے۔ اگر جلد ہی کوئی ایسا جامع نظام تعلیم مرتب نہ کیا گیا تو عامۃ المسلمین اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس دوہرے ٹیکس سے نجات حاصل کرنے کے لئے خود ہی کوئی طریقہ ایجاد کر لیں۔

دونوں نظامہائے تعلیم اپنے اغراض و مقاصد کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ وہ مختلف ذہن پیدا کر رہے ہیں۔ نقطہ نظر کا یہ اختلاف ہمارے ہاں ذہنی و نفسیاتی کشمکش ، معاشرتی و سیاسی انتشار ، اقتصادی و قانونی فساد و بدنظمی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ ملک کی ترقی کے لئے یونیورسٹی کے فارغ التحصیل علماء کی طرف سے بنایا ہوا کوئی منصوبہ ، مدرسہ کے فارغ التحصیل علماء کے لئے لازماً تکلیف دہ ہوتا ہے۔ صوبائی اورقومی اسمبلی میں بننے والے مختلف قوانین کی مخالفت " مدرسہ " کا فرض اولین ہے۔ " یونیورسٹی " اور " مدرسہ " دو اسلحہ ساز فیکٹریوں کی طرح اپنی اپنی پیداوار میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔ اسلحہ کی فراوانی کے باعث نظریاتی جنگ بلا انقطاع جاری ہے۔ دراصل اس تکلیف دہ اور افسوسناک صورت حال کا نتیجہ نظریاتی اختلاف ہے ، جس کے باعث پاکستان کوئی مستقل آئین بنانے میں ناکام رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم کوئی متفقہ نظریہ حیات اپنانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

ان دو متضاد اور خود مختار نظام ہائے تعلیم کی موجودگی میں کسی

متحدہ قومی نقطہ نظر کا ظہور پذیر ہونا نا ممکن ہے اور ایسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا خود فریبی ہے۔ عائلی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی اور بہت سے ایسے معاشرتی اور اقتصادی قوانین کی "مدرسہ" کی طرف سے شدید مذمت ہو چکی ہے۔ اور مستقبل میں کسی بھی یکطرفہ قانون سازی کا یہی حشر ہوگا۔ اس لئے مدارس کی تعداد اور ان کی پیداوار کی مقدار کا سوال نہیں، اصل مسئلہ اس روایتی مقام کا ہے جو انہیں معاشرے میں حاصل ہے، اور جس کے زور پر وہ جب چاہتے ہیں حالات کو اپنی موافقت میں بدل لیتے ہیں اور زندگی کے کسی بھی شعبہ میں نافذ ہونے والی اصلاحات کے خلاف مہم چلا لیتے ہیں۔

مسلسل نظریاتی اختلاف و تصادم نے قوم کو اخلاقی طور پر بالکل مفلوج کر دیا ہے۔ منافقت، دھوکہ بازی، اور بد دیانتی وغیرہ کا جواز اسی صورت حال کا نتیجہ ہیں۔ ہر فریق اپنے مد مقابل کے خلاف جنگ میں ہر اقدام کو جائز سمجھتا ہے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر سرکاری ملازمت کی وجہ سے حکومت کی نافذ کردہ خاندانی منصوبہ بندی کی سکیم پر دن رات عمل کرتا ہے، لیکن دوسری طرف مسجد و مدرسہ سے منصوبہ بندی کے خلاف فتویٰ کے باعث وہ مذہبی وابستگی کی بنا پر اس سکیم سے نفرت کرتا ہے۔ اسی طرح بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور دوسرے تجارتی و اقتصادی اداروں کے ملازمین کے دل و دماغ دو حصوں میں منقسم ہیں، ایک طرف وہ روٹی کے لئے ملازمت اور اس کی ذمے داریاں نباہتے ہیں، دوسری طرف دل ہی دل میں اپنی ملازمت سے نفرت کرتے ہیں۔ اس صورت حال سے معاشرہ میں اضطراب و بے چینی کے سوا اور کس چیز کو فروغ حاصل ہوگا؟

ان وجوہ کی بنا پر بلا خوف لومۃ لائم ہمارا خیال ہے کہ دونوں نظامہائے تعلیم کی موجودگی میں یونیورسٹی کے نظام و نصاب تعلیم میں کوئی اصلاح، اساتذہ کے عہدے اور ان کی فلاح کے لئے بہتر وعدے، تعلیمی پالیسیوں کی ترتیب نو

کوئی تعمیری نتیجہ پیدا نہیں کر سکیں گے۔ جب تک دونوں نظاموں کے مکمل ادغام کی طرف توجہ نہیں دی جاتی، نظریاتی اتحاد اور قومی نقطہ نظر کا پیدا ہونا محال ہے۔ مدارس کو یونیورسٹی سے الگ رکھ کر دونوں نظاموں کی ''پیدا وار'' کے ذہنوں میں ایک خلا پیدا کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے سے خائف رہتے ہیں۔ یونیورسٹی کی پیدا وار کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ ان کی ڈگریاں بالکل بے سود ہیں، کیونکہ اصل علم تو نظام مدرسہ کا علم ہے جس سے وہ محروم ہیں، اور مدرسہ کی پیدا وار کے دل میں یہ بات بٹھائی جاتی ہے کہ قدیم زمانے کے علوم پر دسترس حاصل کرنا بالکل بے سود ہے، کیونکہ اصل علوم تو وہ ہیں جو مغرب نے پیدا کئے، اور جو ہمارے روز مرہ کے حالات و مسائل کو حل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

طلب علوم کے بارے میں جو آزادی اور تاکید دین اسلام میں ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ ہم نے اس مضمون کے آغاز میں ثابت کیا ہے کہ اسلام میں علم فی نفسہ مفید ہونے کے ساتھ ساتھ ایمان کا حصہ بھی ہے۔ علم کی اسی اہمیت کے پیش نظر مسلمانوں نے ہر قسم کے علوم کی تحصیل کا اہتمام کیا، اور علم جہاں کہیں نظر آیا، اسے اپنی گم شدہ متاع سمجھ کر، اپنایا، اس کی سرپرستی کی، اس کی ترقی و ترویج میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ''الحکمة ضالة المومن اینما وجدها التقطها'' حکمت و دانائی کے علوم مومن کی گمشدہ متاع ہیں جہاں کہیں انہیں پائے، اپنائے'' پھر '' خذ ما صفا دع ما کدر'' اچھی چیز کو اپناؤ، بری چیز کو ترک کرو،'' کے اصول کے تحت، مسلمان کسی علم سے ڈرنے یا خوف کھانے کے بجائے، نہایت حوصلے اور جرأت سے اسے حاصل کرتا، اس کے حسن و قبح کو ہر پہلو سے پرکھتا، اس کے اصول و مبادی

کی تہ تک پہنچتا اور پورے تجزیہ و تحلیل کے بعد "قرآنی فرقان" کی روشنی میں اخذو ترک کے اصول کے تحت اس کے مفید و کار آمد عناصر کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیتا۔ علم کے ساتھ قرآن کے پیدا کئے ہوئے عشق اور وحی الٰہی کی دی ہوئی فکر نے مسلمانوں کو علمی و فکری طور پر اوج ثریا تک پہنچا دیا تھا، وہ دنیا کے کسی علم کے سامنے احساس کمتری یا کسر نفسی میں مبتلا نہیں ہوتے تھے، عربوں کو اپنی عربیت اور لسانی فصاحت و بلاغت پر جو غرور تھا، قرآن نے اسے پاش پاش کر دیا اور اس کی جگہ اسلامی عربی روایت کی بنیاد رکھی۔ جزیرہ عرب کے باہر اسلام کا دو عظیم تہذیبوں سے واسطہ پڑا، ان میں سے روم کو اپنے "قانون" پر ناز تھا اور ایران کو اپنی ثقافت و ادب پر فخر تھا۔ صدر اسلام کے فقہاء نے رومی قانون کی روایات میں سے وہ اجزاء جو اسلامی مزاج کے موافق تھے، اپنائے، حتی کہ وہ اسلامی فقہ کا حصہ بن گئے۔ ان بنیادی اصولوں کے اخذ کا نتیجہ تھا کہ رومی قانون کی عظمت جاتی رہی اور اس کی جگہ اسلامی قانون کی بالا دستی قائم ہو گئی۔ ایران میں جس ادبی روایت کا چرچا تھا مسلمان ادباء نے اس کا مطالعہ کیا، اور جب ایرانی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو انہوں نے عربوں کے ساتھ مل کر عربی ادب کو چار چاند لگائے، ایرانی ادب پسپا ہوا اور عربی ادب کا تسلط پوری طرح قائم ہوگیا۔ اس کے علاوہ جن علوم کا براہ راست مسلمانوں سے تصادم نہیں ہوا تھا، خود مسلمانوں نے ان کا کھوج لگایا۔ یونان میں فلسفے کا بڑا چرچا تھا۔ خود مسلمان خلفاء نے بے شمار یونانی فلسفہ کی کتب کا عربی میں ترجمہ کروایا تا کہ مسلمان حکماء اس دعوت مبارزت میں آگے بڑھیں اور دنیا پر یونانی فلسفے کے تسلط کا زور توڑ دیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلم فلاسفہ نے یونانی فلسفے کے اصول و مبادی کا مطالعہ کیا اور اس کے

مقابلے میں اسلامی فلسفے کو پیش کر کے یونانی فلسفے پر اپنی بالا دستی قائم کر دی۔ ہند و چین میں بھی اگر کوئی چیز قابل اعتنا تھی، تو اسے مسلمانوں کے دارالخلافہ میں لایا گیا، جو در اصل علوم و فنون کا مرکز ہوتا تھا، اور مسلمان علماء، حکماء اور فلاسفہ کو ان کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ مسلمانوں نے ان علوم کی گہرائیوں میں جا کر ان مفید عناصر کو چن لیا جو عالمگیر سطح پر انسانیت اور اسلام کے لئے کار آمد ہو سکتے تھے۔ ہمارے خیال میں اسلام کو باقی ادیان پر غالب کرنے (لیظهره علی الدین کله) کا یہی طریقہ سب سے عمدہ اور سب سے بہتر تھا، (ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة) نظام ربوبیت کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت دینے کے اصول کے پیش نظر ایک طرف مسلمان مجاہدین نے میدان کار زار میں اسلام کو غالب کیا تو دوسری طرف علماء، حکماء اور فلاسفہ نے علمی و فکری میدان میں یہ کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ آج بھی ہمیں علمی میدان میں وہی طریقہ اپنانا ہے۔ دنیا میں مروج فکری نظریات سے مسلمانوں کو ڈرانے کے بجائے انہیں اس قابل بنانا ہے کہ وہ سرمایہ داری، اشتراکیت اور کمیونزم وغیرہ نظریات کا کھل کر مطالعہ کریں تاکہ ان میں مضر انسانیت عناصر کو پسپا ہونے پر مجبور کر سکیں اور ان کے مفید و کار آمد اجزاء کو اپنے تعلیمی نصاب میں سمو سکیں۔

یہ عام نظریہ کہ جدید تعلیم کے فروغ سے نظام مدرسہ خود اپنی موت مر جائے گا، حقیقت پر مبنی نہیں۔ ہمارے سامنے عہد حاضر کی دو مثالیں موجود ہیں۔ ایک یورپ و امریکہ کی، اور دوسرے کمیونسٹ ممالک کی۔ یورپ نے صدیاں لگانے کے بعد اس مسئلے کا حل یہ سوچا کہ دین اور سیاست کو الگ الگ کر دیا، کمیونسٹ دنیا نے سرے سے دین کو ختم کر کے اس مسئلہ کا حل تلاش کیا۔ پاکستان عصر حاضر کی تیز رفتاری میں، نہ تو یورپ کی

طرح صدیوں انتظار کر سکتا ہے ، نہ ہی مدرسے اور مسجد کو چھوڑ کر زندہ رہ سکتا ہے ۔ ہمیں اپنے مخصوص حالات کی بنا پر اپنا مسئلہ اجتہاد سے خود ہی حل کرنا ہے اور اس کا بہترین حل یہ ہے کہ دونوں نظاموں میں مکمل ادغام کر دیا جائے اور دو رنگی ختم کر کے یک رنگی پیدا کی جائے ۔

دونوں نظاموں کے ادغام کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دونوں کا نچوڑ لے کر اسے اس طرح ملا دیا جائے کہ وہ یک جان ہو جائیں ۔ ہمارے خیال میں یہ نظریہ بالکل بے بنیاد ہے کہ ایسا کرنے سے خواہ مخواہ طلبہ کو نصاب کے بوجھ تلے دبایا جائے گا ۔ کیونکہ ادغام کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دونوں نظاموں کی ابتدا ، ارتقاء اور پوری تاریخ ایک دوسرے کے ساتھ رکھ دی جائے ، بلکہ اس سے مراد یہ ہوگی کہ دونوں نظاموں کے علوم و مضامین کی جانچ پڑتال کی جائے ، انہیں چھانا پھٹکا جائے ، اور پورے تجزیہ کے بعد ایسے عناصر کو چن چن کر جمع کیا جائے ، جو مسائل حاضرہ اور مقتضیات زمانہ سے پوری مطابقت اور ہمارے اقتصادی ، معاشی ، قانونی اور سیاسی مسائل کے ساتھ ہم آہنگی رکھتے ہوں ، ماضی اور حال کے علوم کی تاریخ ابتدا ، مراحل ارتقاء چھوڑ کر تصورات ، خیالات اور نظریات و فلسفہ کا خلاصہ نکال لیا جائے ۔

موجودہ اختلاف و تصادم کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ زندگی کے بعض شعبوں میں تو یہ بڑا متحرک اور جاندار ہے ، لیکن بعض دوسرے شعبوں میں نہایت جامد اور بے جان ، خونریز تصادم عموماً معاشرتی علوم میں ہو رہا ہے اور طبعی علوم میں اس کا وجود بہت کم ہے ۔ سائینسی علوم نصاب مدرسہ میں داخل نہیں ، غالباً اسی لئے مدرسہ کے طلبہ نہ تو ان علوم کے اس ماضی سے پوری طرح آگاہ ہیں ، جس میں مسلمان سائینسدانوں اور فلاسفہ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے ، اور نہ ہی اس کے حال سے بخوبی واقف ہیں ، جس میں

مغرب نے حیرت ناک ترقی کی ہے۔ مغرب نے تو صدر اسلام اور ازمنہ وسطیٰ کے مسلم سائنسدانوں کے افکار و نظریات پہلے ہی اپنا لئے ہیں اور مغربی سائنسدانوں نے ان افکار و نظریات کو مزید ترقی دے کر اپنے تصورات و افکار میں جگہ دے لی ہے۔ لہذا اب زمانۂ قدیم کے سائنسدانوں کی تاریخ پیدائش و وفات اور ان کی فروعی تفصیلات بتانے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی۔ مدرسہ بھی اس حقیقت سے واقف ہو چکا ہے، چنانچہ ہمارے علماء سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں، کہ یونانی فلسفہ و حکمت جو کبھی ضرورت کے تحت مسلمانوں نے اپنائے تھے، اگر ان کی جگہ آج وہ مغربی علوم و افکار و تجربات لے لیں جو اسلام کے لئے قوت فراہم کریں، تو یہ تبدیلی نہایت خوش آئند ہوگی۔

عملی ادغام کے دائرہ کو محدود کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت صرف تین ایسے بنیادی موضوعات ہیں، جن کا ادغام فوری طور پر نہایت ضروری ہے۔ ہم بقیہ علوم و موضوعات کی اہمیت کے منکر نہیں، تاہم اگر ان تین علوم و موضوعات کے بارے میں جو کچھ مواد نظام مدرسہ میں موجود ہے، اسے انتہائی مہارت اور کامیابی کے ساتھ یونیورسٹی نظام میں سمو لیا جائے، تو نظام مدرسہ میں دینیات ہی باقی رہ جائے گی۔ یہ تین مضامین، قانون، معاشیات اور سیاسیات ہیں۔ قیام پاکستان کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا کہ "مسٹر" اور "مولوی" کی لڑائی عام طور پر انہیں تین میدانوں میں ہوتی رہی ہے۔ عائلی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی، بینکنگ، انشورنس، حاکمیت اعلیٰ کا تصور وغیرہ مسائل انہیں مضامین کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ انتہائی حکمت و دقت اور حزم و مہارت سے ان مضامین سے متعلق تفاصیل اسلامی علوم سے اس طرح جمع کی جائیں کہ کوئی قابل اعتنا چیز باقی نہ رہ جائے، اور یہ انتخاب یونیورسٹی نصاب میں حسن و خوبی کے ساتھ سمو دیا جائے۔

طریق کار یہ ہو کہ قانون، معاشیات اور سیاسیات کو باقی تمام مضامین پر ترجیح دی جائے اور کالج کے بقیہ مضامین میں ان مضامین کو خصوصی اہمیت حاصل ہو۔ ان مضامین کے موجودہ نصاب کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ان میں اسلامی نقطہ نظر کے لئے پوری گنجائش موجود ہو، ان مضامین کی تدریس کے لئے خاص طور پر اہتمام کیا جائے اور ملک کے ذہین اور ہونہار طلبہ کے لئے وظائف وغیرہ کی کافی کشش مہیا کی جائے۔ وہ طلبہ جو قانون، معاشیات اور سیاسیات میں تخصص حاصل کرنا چاہیں، ان کے لئے لازمی ہو کہ وہ کالج کے پہلے ہی سال ان مضامین کو اپنالیں اور بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی تک ان میں مہارت تامہ حاصل کریں۔ اس طرح ہمارے مستقبل کے قانون دان، ماہرین معاشیات و سیاسیات اپنی نظیر آپ ہوں گے، وہ انتہائی قابل، اہل اور ثقہ ماہرین ہوں گے، اور وہ اسلام کو دور جدید میں ایک متحرک اور قابل عمل دین کی حیثیت سے پیش کرنے کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتے ہوں گے، مستقبل کے یہ ماہرین اس مقام پر فائز ہوں گے کہ ''مدرسہ اور یونیورسٹی'' دونوں کے فاضلین ان کی بات پر توجہ دے سکیں گے۔ اس طرح پاکستان کو وہ بلند مقام حاصل ہوگا کہ نہ صرف مسلم دنیا بلکہ غیر مسلم دنیا بھی، پاکستان سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کرے گی۔

حواشی

۱ - امام بخاری، صحیح بخاری، کتاب العلم

۲ - ایضاً

۳ - امام طبری - التفسیر الطبری، الجزء السادس و العشرین، ص ۹۰ و قوله ولما یدخل الایمان فی قلوبکم یقول تعالیٰ ذکرہ و لما یدخل العلم بشرائع الایمان و حقائق معانیه فی قلوبکم۔

۴ - ابن ماجہ ، السنن -

۵ - امام بخاری ، صحیح بخاری ، کتاب العلم -

۶ - سید سلیمان ندوی ، سیرۃ النبی ، جلد ششم -

۷ - یہ اتفاق کی بات ہے کہ جمع وکتابت قرآن میں انصار مدینہ نے سب سے زیادہ شوق اور دلچسپی دکھائی ، انس بن مالک کی روایت کے مطابق جن حضرات نے عہد رسالت میں قرآن حکیم جمع کیا تھا وہ چار تھے ، اور وہ چاروں انصار میں سے تھے : قال قتادۃ سالت انس بن مالک من جمع القرآن علی عہد النبی صلی اللہ علیہ و سلم قال اربعۃ کلھم من انصار ، ابی بن کعب و معاذ بن جبل و زید بن ثابت و لو زید - دوسری روایت میں ابوالدرداء بھی ان صحابہ میں شامل ہیں ، جنھوں نے عہد رسالت میں قرآن جمع کیا تھا (امام بخاری ، صحیح بخاری ، کتاب ابواب فضائل القرآن) -

نظامِ زکواۃ اور طب و صحت کی اہمیت

زکواۃ کے مصارف میں ,, فقراء ،، کی ایک مد ہے جن میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو بنیادی ضروریات میں سے کسی ضرورت کو پورا کرنے کی قدرت نہ رکھتے ہوں زکواۃ کے مصارف کی دوسری مد ,, مساکین ،، ہے یہ ان تمام لوگوں کو اپنے دائرہ میں لے لیتی ہے جو بنیادی ضروریات میں سے کسی ایک ضرورت یا کئی ضرورتوں کو پورا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے مثلاً کھانے کو ہے تو اوڑھنے اور پہننے کو نہیں، پہننے کو ہے تو سر چھپانے اور رہنے کو گھر نہیں بچوں کو تعلیم دلانے کا مقدور ہے تو صحت و علاج کے لئے کوئی وسیلہ نہیں۔ ایک بڑا مصرف زکواۃ ,, فی سبیل اللہ ،، ہے جس میں رفاہ عامہ کا ہر کام داخل اور اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچانے کی ہر کوشش شامل ہے۔

زکواۃ کے ایک معنی تطہیر و تزکیہ اور نشو و نما دینے کے بھی ہیں لہذا کسی قوم کی اجتماعی یا انفرادی خرابیاں دور کرنا، اور ان کی بیماریوں کا مداوا کرنا بھی فریضہ زکواۃ کی ادائی میں شمار ہو گا۔ اگلے صفحات میں ہم صحت کی اہمیت کا موضوع زکواۃ کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ اسلامی حکومت جو زکواۃ کے جمع و خرچ کی ذمہ دار ہے اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنی ذمہ داریوں کو بجا لانے کا پورا پورا اہتمام کرے۔

طبی نقطہ نظر سے اسلامی تعلیمات پر نظر ڈالی جائے تو عربی کے اس

جملے کی صداقت پر یقین آنے لگتا ہے: ''العلم علمان علم الادیان و علم الابدان '' علم دو ہیں ایک علم دین اور دوسرا علم صحت بدن۔ کتب طب میں اس قسم کے جملے اسلامی تعلیمات میں صحت کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ قرآن حکیم کا حکم ہے: '' و لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ '' (۲: ۱۹۵) اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

بیماری انسان کے ذہنی و جسمانی قویٰ کو مفلوج کر دیتی ہے، اور ان کی تباہی و ہلاکت پر منتج ہوتی ہے۔ جو شخص اپنی صحت و تندرستی کا خیال نہیں کرتا اور بیمار ہونے پر اپنا علاج نہیں کرتا وہ '' و لا تقتلوا أنفسکم'' اپنے آپ کو تباہ نہ کرو، کے بموجب قرآن کی نظر میں خود کشی کا مرتکب ہوتا ہے۔ خود کشی کا معروف طریقہ تو سب ہی جانتے ہیں لیکن بہت کم لوگ اس راز سے واقف ہیں کہ ایسے حالات پیدا کر لینا بھی خود کشی ہے جو نتیجۃً ہلاکت کا سبب بنیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے دونوں برابر ہیں۔ صحت کی حفاظت نہ کرنا اور بیماری کی صورت میں علاج نہ کرنا خود کشی ہے، اور مذکورہ بالا آیات کے مطابق اسلام میں خودکشی حرام ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی شخص اپنی جہالت کی بنا پر صحت و تندرستی کی حفاظت اور بیماری کی صورت میں اس کے علاج سے ناواقف ہے تو اس کا ذمہ دار وہ معاشرہ یا نظام ہے جس کا وہ فرد رکن ہے۔ امام حموی نے ایسی ہی صورت حال کے بارے میں لکھا ہے:

و لو قال قائل: لا آکل و لا اشرب فان اللہ یطعمنی و یسقینی لکان عاصیا بالاجماع لانہ خالف موضوع الحکمۃ (۲)۔ اگر کوئی کہے کہ نہ میں کھاؤں گا نہ پیوں گا، اس لئے کہ اللہ مجھے کھلائے گا اور وہی مجھے پلائے گا تو ایسا شخص بالاجماع حدود اللہ کو توڑنے والا ہوگا کیونکہ اس نے موضوع

حکمت کی خلاف ورزی کی ہے۔ امام حموی اس کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لانه القی نفسه الی التلف و قد نهی الله عزوجل عن ذلك (۳) کیونکہ ایسے شخص نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے حالانکہ اللہ عزوجل نے ایسا کرنے سے منع کر رکھا ہے۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے صحت کی اسی اہمیت کے پیش نظر فرمایا تھا: الطهور شطر الایمان (۴) طہارت (حفظان صحت کے اصولوں) پر عمل کرنا نصف ایمان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مطابق حفظ و برقراری صحت جزو ایمان ہے۔

طب و صحت کے بارے میں اسلامی تعلیمات کے چند بنیادی نکات یہ ہیں:

۱ - علم طب اسلام کے دو بنیادی علوم میں سے ایک ہے۔

۲ - صحت و تندرستی کی حفاظت و برقراری فرائض دینیہ میں سے دینی فریضہ اور جزو ایمان ہے۔

۳ - عدم تحفظ صحت اور بیماری کا علاج نہ کرنا خودکشی ہے جو اسلام میں حرام ہے۔

۴ - جاہل و پسماندہ معاشرے میں حفظ و بر قراری صحت اور بیماری کے علاج کا شعور پیدا کرنا اس معاشرے کے ارباب اختیار کا فریضہ ہے، اور اس میں کوتاہی معصیت کا ارتکاب ہے۔

اسلامی تعلیمات میں علوم طبیہ کی یہ اہمیت اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی وجہ سے اسلام ادیان عالم پر فوقیت رکھتا ہے۔ اسلام ظلم اور فتنہ و فساد کو روکنے کے لئے ہر مناسب اقدام کی حمایت کرتا ہے۔ حکم خداوندی ہے: ”و قاتلوهم حتی لا تکون فتنة و یکون الدین کله لله“ (۵) کفار سے

برسرپیکار رہو حتی کہ فتنہ و فساد باقی نہ رہے اور (امن و امان پر مبنی) اللہ کا دین کلی طور پر قائم ہو جائے۔

اسلام انسانیت کو جن اعلیٰ مقاصد پر فائز کرنا چاہتا ہے اس کے لئے سب سے پہلے امت مسلمہ کو ہر قسم کی قوتوں سے خود کو آراستہ کرنا ضروری ہے، ان قوتوں میں صحت و تندرستی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیت بنیادی حکم کی حیثیت رکھتی ہے:

"و أعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل ترهبون به عدو الله و عدوكم و آخرين من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم" (٦) اور (مسلمانو!) جہاں تک تمہارے بس میں ہے کفار سے مقابلہ کے لئے ہر قسم کی قوت اور سرحدی حفاظت کے لئے سوار دستوں کو تیار رکھو ان اقدامات سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھو گے۔ اور ان دوسرے دشمنوں پر بھی جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔

اس آیت میں "من قوة" اور "من رباط الخيل (٧)" بڑے ہی بنیادی امور ہیں۔ "قوة" ایک جامع لفظ ہے جو مادی و معنوی تمام قوتوں پر محیط ہے۔ ہمارے خیال میں قومی قوتوں میں افرادی قوت کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ افراد ہی دراصل باقی قوت و توانائی کو پیدا کرنے والے ہوتے ہیں۔ افراد کی ذہنی و جسمانی تندرستی وہ قوت ہے جو بے شمار دوسری تخلیقی قوتوں کو جنم دے کر اجتماعی قوت و توانائی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیتی ہے۔ یہ آیت اسلامی حکومت پر امت مسلمہ کے ہر فرد کی صحت و توانائی کی نگہداشت کا فریضہ عائد کر رہی ہے۔

اس حکم پر عمل کرنے کے لئے امت مسلمہ کی صحت اور تندرستی کے لئے معمولی طبی انتظامات کر دینا کافی نہیں، ضروری ہے کہ :

۱ - مسلمان حکومت، ملت کے ہر فرد کی صحت کی برقراری اور اس کی قوت و توانائی میں مسلسل اضافے کے مکمل انتظامات کرے اور ان انتظامات کو اللہ کی طرف سے فریضہ سمجھے (اعدوا لھم ما استطعتم)

۲ - پوری امت کی صحت و توانائی کا یہ عالم ہو کہ خدا اور مسلمانوں کے کھلم کھلا دشمنوں پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہوئی ہو (ترھبون بہ عدو اللہ و عدوکم)

۳ - مسلمان بحیثیت مجموعی اتنے طاقتور، قوی، تندرست و توانا ہوں کہ ان کے کھلے دشمنوں کے علاوہ چھپے دشمن بھی ان سے مرعوب ہوں۔ اور وہ مسلمانوں کے مقابلہ کی ہمت نہ کر سکیں (و آخرین من دونھم لا تعلمونھم اللہ یعلمھم)

آئندہ صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، جو اس حکم الٰہی کے سب سے پہلے مخاطب تھے، بحیثیت سربراہ مملکت اسلامیہ امت کو اس پر عمل کرانے کے لئے کیا کیا اقدامات کئے۔ یہ جائزہ دو حصوں پر مشتمل ہوگا - ۱ - وہ اقدامات جو حیات و صحت کی برقراری کے لئے ضروری ہیں ۲ - وہ اقدامات جو قوت و توانائی میں مسلسل اضافے کے لئے لازمی ہیں۔ پہلے حصہ میں ہوا، روشنی، حرارت، پانی، غذا پر بحث ہوگی اور دوسرا حصہ اسلامی ضابطہ صحت اور طبی ہدایات پر مشتمل ہوگا۔

بقائے حیات و صحت کے بنیادی جز، ہوا کے بارے میں اسلام دو باتوں کو بڑی اہمیت دیتا ہے ۱ - ہوا کافی مقدار میں ہو، ۲ - ہوا صاف اور پاکیزہ

ھو۔ ھوا کی کمی کا احتمال عام طور پر آبادیوں میں رھائشی مکانات اور انسانی اجتماعات میں ھوتا ھے جہاں تک رھائشی مکانات کی طرز تعمیر کا تعلق ھے قرآن حکیم نے اس سلسلے میں چند بنیادی اصول دئے ھیں اور مسلمانوں کو ایمان کے تقاضے کے طور پر ان اصولوں کی پابندی کا حکم دیا ھے۔

۱ ۔ ''مساکن ترضونھا'' (۸) ایسے مکانات جو ھوا ، روشنی ، حرارت کی فراوانی کی وجہ سے فرحت بخش اور پسندیدہ ھوں ۔

۲ ۔ '' مساکن طیبہ '' (۹) مکانات ۔ صحت بخش ، ھوا دار ، کھلے ، صاف ستھرے اور پاکیزہ ھوں ۔

۳ ۔ '' فی مسکنھم آیۃ (۱۰) جنتان عن یمین و شمال '' نمونے کے مکانات جن کے دائیں بائیں خوشگواری ۔ پاکیزگی ۔ صفائی اور صحت کے لئے درخت ، پتے ، سبزہ اور باغات ھوں ۔

۴ ۔ '' بلدۃ طیبۃ '' (۱۱) صاف ستھرا ، پاکیزہ ، ھوا دار ، روشن ، کھلا مثالی شہر ۔

۵ ۔ ''قریۃ کانت امنۃ مطمئنۃ ''(۱۲) پر امن (ھر قسم کے دشمنوں اور جراثیم سے) محفوظ و مامون نیز شور و غل اور گندگی و غلاظت سے پاکیزہ مطمئن بستی ۔

قرآن حکیم کے بتائے ھوئے نقشے کے مطابق مسلمان صرف ایسے مکانات میں سکونت پذیر ھو سکتے ھیں جو قرآنی اصولوں کے مطابق ھوا دار ، روشن ، صاف ستھرے اور پاکیزہ ھوں اور جن کی خوشگواری ، پاکیزگی ، صفائی اور صحت بخش فضا کو بر قرار رکھنے کے لئے ان کے دائیں بائیں درخت ھوں سبزہ اور باغات کی فراوانی ھو ، اور ان مکانات پر مشتمل محلے اور بستیاں ایسی ھوں جو

سکون اور پاکیزگی کے اعتبار سے ''قریۃ آمنۃ مطمئنۃ'' کہلا سکیں اور ان پرسکون اور پاکیزہ محلوں پر مشتمل ایسے شہر ہوں جو اپنی صفائی، ستھرائی، کشادگی، روشنی وغیرہ کے اعتبار سے ''بلدۃ طیبۃ'' کہلانے کے صحیح معنوں میں مستحق ہوں۔ مکانات کی طرز تعمیر کے بارے میں قرآنی اصولوں کا تقاضا ہے کہ تمام مسلمان اپنے مکانات انہیں اصولوں کے مطابق بنائیں اور اگر مسلمانوں میں اس کا شعور نہ ہو تو حکومت وقت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ یا تو خود ہر مسلمان کے لئے قرآنی اصولوں پر مبنی مکانات تعمیر کرے یا مسلمانوں کی مدد کرے کہ وہ اپنے مکانات صحت کے اصولوں کے مطابق تعمیر کریں جن میں زندگی و تندرستی کی حفاظت کے لئے مناسب، ہوا، روشنی اور حرارت دستیاب ہو، بصورت دیگر بیماریوں سے بچاؤ ممکن نہیں اور بیماری چونکہ انسان کی ذہنی، دماغی اور جسمانی قوتوں کو تباہ کر دیتی اور بالاخر خود انسان کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے اس لئے صحت و حیات کی برقراری سے غفلت برتنا اور اس طرح اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا خودکشی کے مترادف ہے اور خودکشی اسلام میں حرام ہے۔ اس لئے مکانات کو قرآنی اصولوں کے مطابق تعمیر نہ کرکے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا حرام ہے۔ اگر مسلمان اس جرم کا اتکاب کر رہے ہوں اور مسلمان حکومت انہیں اس سے نہیں روکتی اور انہیں خودکشی سے نہیں بچاتی تو ایسی صورت میں حکومت بھی ارتکاب جرم میں شریک ہو جاتی ہے۔

مکانات کی طرز تعمیر کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے کہ مسلمان بالعموم اور مسلمان حکومت بالخصوص جدید سے جدید سہولتوں اور اعلیٰ سے اعلیٰ ایجادات کے مطابق مختلف سکیموں اور پلانوں کے تحت ایسے مکانات بنائے جو صحیح معنوں میں ''مساکن ترضونہا'' اور ''مساکن طیبۃ'' کا مصداق ہوں اور ان کا مجموعہ ''بلدۃ طیبۃ'' اور ''قریۃ آمنۃ مطمئنۃ'' ہو۔

جہاں تک اجتماع گاہوں میں وافر ہوا کی موجودگی کا تعلق ہے اسلام نے اس طرف بھی توجہ دی ہے ، مسلمانوں کے بڑے بڑے اجتماع عام طور پر نماز پنجگانہ ، جمعہ ، عیدین اور حج وغیرہ کے موقع پر ہوتے تھے ، اس ضمن میں ادیان عالم میں یہ امتیاز شاید صرف اسلام کو حاصل ہے کہ زمین اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ مسلمانوں کے لئے سجدہ‌گاہ بنا دی گئی ہے ، حضور صلی اللہ علیہ و سلم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے : میرے لئے ساری زمین سجدہ گاہ بنا دی گئی ہے جہاں بھی کسی مسلمان کے لئے نماز کا وقت آئے وہیں پڑھ لیا کرے (۱۳) مسلمانوں نے اسلام کی اسی وسعت نظر کی روشنی میں مساجد تعمیر کیں اور اس وقت روئے زمین پر پھیلی ہوئی قدیم اور جدید مساجد اس بات کی گواہ ہیں کہ مسلمانوں کی سجدہ گاہیں مذاہب عالم کی عبادت گاہوں میں سب سے زیادہ وسیع ، کشادہ ، ہوا دار اور پرفضا ہیں اور صحت و صفائی کے اعتبار سے سب پر فوقیت رکھتی ہیں نماز پنجگانہ اور نماز جمعہ مساجد میں ادا کی جاتی ہیں ، لیکن نماز عیدین کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اکثر کھلے میدان کو ترجیح دیتے تھے ۔ اجتماع حج کے لئے بیت اللہ میں وسعت و کشادگی کا عمل تاریخ اسلام میں مسلسل جاری رہا ہے اور آج بھی اس کی حدود میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے ، پھر اسلام کے طریق عبادت میں صف بندی اور صفوں کے درمیان سجدہ کے لئے ایک خاص فاصلہ کو صحت کے اصولوں کے پیش نظر خاص اہمیت حاصل ہے ۔ اسلام نے رہبانیت اور خلوت نشینی کی اس لئے بھی مذمت کی ہے کہ تنگ و تاریک غاریں اس طرز زندگی کا خاصہ ہیں ۔ اس لئے اسلام نے ” لا رهبانية فی الاسلام “ (اسلام میں رہبانیت نہیں) کے ذریعے اس سے منع فرما دیا ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے بھی اس کے بعد غار حرا کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا ۔

زندگی کے لئے صاف ہوا لازمی ہے لہذا گندی اور کثیف ہوا کو سخت ناپسند کیا گیا ہے، صاف اور پاکیزہ ہوا کو مرغوب و مطلوب قرار دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں پاک اور صاف ہوا کو ''ریح طیبۃ'' (۱۴) کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی ایسی ہوا جو کثافتوں اور گندگیوں سے صاف اور مضر صحت اجزاء سے مبرا ہو، حیات بخش اور مفید صحت ہو۔ موجب فرحت و انبساط ہو۔ اسلام نے صاف ستھری اور پاکیزہ ہوا کو محض اخلاقی تعلیم کی حد تک نہیں رہنے دیا۔ بلکہ اس کے حصول کے لئے عملاً اقدامات کئے۔ صاف ہوا کی دستیابی کے لئے رہائشی مکانات اور انسانی اجتماعات کے مراکز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا کہ اسلام نے یہ کام محض افراد کی صوابدید پر نہیں چھوڑا بلکہ ایک ضابطے کے تحت مسلمان حکومت پر یہ فرض عائد کیا کہ وہ ''مساکن طیبۃ'' اور ''بلدۃ طیبۃ'' کی تعمیر کا اہتمام کرے۔ جن میں گندگی، غلاظت اور تعفن نہ ٹھہرسکے اور ہر طرف صفائی، ستھرائی اور پاکیزگی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے انسانی آبادی میں گندگی اور غلاظت پھیلانے اور اسے برقرار رکھنے والے پر اللہ کی لعنت کی وعید سنائی ہے۔ (۱۵) اس سلسلے میں اسلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے جراثیم کی ہلاکت خیزیوں کا اندازہ ساتویں صدی عیسوی میں لگا لیا تھا۔ تھوک کے جراثیم سے ہوا کا آلودہ ہونا یقینی امر ہے حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے اس کے مضرات کے پیش نظر ایک دفعہ جب مسجد کی دیوار پر تھوک کو دیکھا تو صحابہ کرام کے مجمع میں خود اپنے دست مبارک سے اسے کھرچ دیا اور اس جگہ خوشبو لگائے جانے پر آپ نے خوشی کا اظہار فرمایا۔ (۱۶) اور ایک حکم کے ذریعے دیواروں، فرشوں اور سیڑھیوں وغیرہ پر تھوکنے سے منع فرمایا (۱۷)

ہوا کی صفائی کے لئے دوسرا بڑا عنصر آبادی میں سبزہ، درخت، پھول اور

پتوں وغیرہ کی موجودگی ہے ۔ہم نے اوپر دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو مثالی شہر '' بلدۃ طیبۃ '' کا نقشہ دیا ہے اس کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے کہ اس کے دائیں ، بائیں باغات و نباتات کی فراوانی ہے جن کے پھول ، پتے اور سبزہ ہوا کو صاف اور پاکیزہ بنا کر '' ریح طیبۃ '' میں تبدیل کرتے رہتے ہیں اور فضا کو مسلسل خوشگوار اور صحت افزا بناتے رہتے ہیں صحت کے اسی اصول کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اکثر مسلمانوں کو پھلدار اور سایہ دار درخت لگانے کا حکم دیا کرتے تھے (۱۸)۔ مدینے کے نواح میں باغبانی ، شجر کاری اور زراعت کی افزائش میں آپ گہری دلچسپی لیتے اور اکثر مساجد کے علاوہ باغات میں نماز ادا فرماتے (۱۹) ۔

فضا کو صاف اور ہوا کو پاکیزہ رکھنے کے لئے خوشبو کا بکثرت استعمال بھی نہایت ضروری ہے ۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کو دنیا کی تین محبوب چیزوں میں سے ایک خوشبو تھی ۔ (۲۰) حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم نے اپنے ذاتی اسوۃ کے علاوہ اجتماعی طور پر جمعہ کے روز مسجد میں انگیٹھیاں جلانے کا باقاعدہ حکم دے رکھا تھا اور آپ کی ہدایت کے مطابق ان میں اگر اور کافور جلایا جاتا تھا (۲۱) ۔ حضور صلعم کا اسوہ حسنہ اور آپ کے دوسرے اقدامات دراصل قرآن حکیم کی ان آیتوں کی عملی تفسیر تھے : '' یا بنی ادم خذوا زینتکم عند کل مسجد '' (۲۲) (اور ہم نے حکم دیا تھا) اے اولاد آدم عبادت کے ہر موقع پر اپنی زیب و زینت سے آراستہ رہا کرو : ''قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ و الطیبت من الرزق (۲۳) (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہو '' خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے برتنے کے لئے پیدا کی ہیں ۔ اور کھانے پینے کی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں ؟ ''

بھاری صنعتوں ، کارخانوں اور ڈیزل و پٹرول کی عدم موجودگی کے باوجود

اسلام نے کثافت ہوا (Air Pollutian) کے مضرات کے انسداد کا مکمل انتظام کر رکھا تھا ۔ اس ابتدائی دور میں کثافت ہوا کا امکان انسانی اجتماعات ہی میں ہوسکتا تھا ۔ چنانچہ آپ ؐ نے یہ بات حکماً نافذ کر رکھی تھی کہ جمعہ کے اجتماع میں شامل ہونے سے پہلے غسل کر کے آنا ضروری ہے ۔ اس اصول پر سختی سے عمل کرایا جاتا تھا ۔ ایک دفعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو بغیر غسل کئے اجتماع جمعہ میں شریک ہوئے ، امیر المومنین حضرت عمر فاروق نے آپ سے اس کوتاہی پر جواب طلبی کی اور یاد دلایا کہ اجتماع جمعہ میں شریک ہونے کا اصول عہد رسالت سے نافذ ہے ۔ اس کے علاوہ حضور ؐ نے حدث اصغر یعنی اخراج ریح کے مسجد میں واقع ہونے کو دوسروں کے لئے موجب اذیت قرار دیا (۲۴) ۔ کثافت ہوا کے انسداد کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے ایک اور حکم جاری کیا جس کے ذریعے کسی شخص کو لہسن ، پیاز یا گندنا وغیرہ کی قسم کی اشیاء کھا کر مسجد میں آنے سے منع کیا گیا تھا جن سے منہ میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ بیٹھنے والوں کو اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے ایک اور حکم کے مطابق مسلمانوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ کوئی شخص لباس یا جسم پر کوئی ایسی بدبودار چیز (تیل دوا وغیرہ) لگا کر نہ آئے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے (۲۵) ۔ حضور صلی اللہ علیہ و سلم کے ان اقدامات سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں کثافت ہوا کے مضرات کے انسداد کا کتنا جامع پروگرام مرتب کیا گیا تھا ۔ خدا اور رسول ؐ کی طرف سے دی گئی ان ہدایات کی بنا پر آج ہمارا فرض ہے کہ ہم آپ کی اتباع سنت میں موجودہ کثافت ہوا کے اسباب و عوامل کا تجزیہ کریں اور ان کی روک تھام کے لئے جدید ترین ذرائع کو استعمال میں لا کر اپنے ماحول اور معاشرے کو صاف ستھرا اور پاکیزہ بنائیں ۔ اسلامی حکومت خاص طور پر اس بات کا

اهتمام کرے کہ ملت کے ہر فرد کو ایسی ہوا دستیاب ہو جو قرآنی اصول کے مطابق صحیح معنوں میں ”ریح طیبۃ“ کی مصداق ہو۔

ہوا، روشنی اور حرارت کے علاوہ بقائے حیات کے لئے پانی کی اہمیت کا اندازہ قرآن حکیم میں ایک جملے سے لگایا جا سکتا ہے: ”وجعلنا من الماء کل شیٔ حیی“ ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندگی بخشی ہے۔ اسلام نے جہاں آب و حیات کے التزام کو بیان کیا وہاں صحت و توانائی کے لئے صاف اور پاکیزہ پانی کو لازمی قرار دیا۔ غلیظ اور گندے پانی کو مضر صحت اور نقصان دہ بتایا۔ قرآن حکیم نے پاکیزہ، شیرین اور طیب پانی کی بے حد تعریف کی ہے۔ جبکہ غلیظ ناپاک اور بدمزہ پانی کی سخت مذمت کی ہے۔ پانی کو طاہر یعنی خود پاک اور مطہر دوسری چیزوں کو پاک کرنے والا بیان کیا گیا ہے۔ فقہاء و محدثین نے پانی کی اس اہمیت کے پیش نظر اس کی صفائی و عدم صفائی پر خاص توجہ دی ہے اور عام اصول وضع کیا کہ جس پانی میں کسی غلاظت کے پڑنے سے اس کے رنگ یا بو یا ذائقہ میں تبدیلی ہو جائے وہ ناپاک ہو جاتا ہے (۲۶) پانی کی صفائی و طہارت کے بارے میں فقہاء کے بعض اختلافات اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ اسلام میں صاف پانی کو حفظان صحت میں بنیادی اہمیت حاصل ہے، پانی کو صاف رکھنے کے لئے حضور صلعم نے کئی اقدامات فرمائے آپ نے حکم فرمایا کہ پانی میں، جو نہانے دھونے یا پینے کے کام آتا ہو، کوئی غلاظت نہ پھینکی جائے نہ اس میں پیشاب یا پاخانہ کیا جائے (۲۷)۔ صدیوں سے ویران اور بیکار پڑے ہوئے کنوؤں کا پانی نہ پیا جائے اور نہ ہی کسی دوسرے استعمال میں لایا جائے (۲۸)۔ جزو حیات پانی کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ مسلم معاشرے کے ہر فرد کو اس بات کی ضمانت دی جائے کہ اسے دستیاب ہونے والا پانی صاف و پاکیزہ اور جراثیم نیز دوسرے مہلک اثرات سے مبرا ہو، ویسے تو ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ صحت کی

برقراری اور قوت و توانائی میں اضافے کی خاطر خود صاف پانی کا اہتمام کرنے اور اگر اپنے محدود ذرائع اور جہالت و لاعلمی کی وجہ سے ہر مسلمان ایسا کرنے پر قادر نہ ہو تو یہ فریضہ مسلمان حکومت کا ہے کہ وہ جراثیم کش ادویہ اور دوسرے جدید ترین ذرائع کو استعمال میں لا کر باشندگان ملک کے لئے صاف پانی کا بندوبست کرے۔

بقائے حیات و صحت کے لئے تیسری اہم چیز غذا ہے، غذا کے ضمن میں اسلامی تعلیمات میں دو باتیں بڑی بنیادی ہیں (۱) کیا کھایا جائے؟ (۲) کتنا کھایا جائے؟ پہلے سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''قل أحل لکم الطیبات'' (۲۹) تمہارے لئے ہر وہ غذا جو طیب (خوشگوار و پاکیزہ) ہے حلال ہے۔ دوسری آیت میں فرمایا: ''و کلوا مما رزقکم اللہ حلالا طیبا'' (۳۰) اللہ کے دیے میں سے حلال و طیب غذا کھاؤ۔ ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ اسلام میں ہر وہ چیز جو حلال اور طیب ہو جائز ہے دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ اسلام میں کسی غذا کا محض حلال ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اس کا طیب، پاکیزہ اور صاف ہونا بھی لازمی ہے۔ اگر کوئی غذا جو فی نفسہ حلال ہو لیکن طیب نہ ہو تو اسلام میں ایسی غذا کا استعمال ممنوع ہے۔ قرآن حکیم میں اکثر حلال کے ساتھ طیب کی تاکید ہے اس لئے ضروری ہے کہ حلال اور طیب کے بارے میں پوری طرح واقفیت حاصل کی جائے۔ حلال و طیب قرآن مجید کی بنیادی اصطلاحیں ہیں، حلال سے مراد کسی چیز کا شرعی اعتبار سے جائز ہونا ہے جبکہ طیب غذا سے مراد اس کا حیاتیات (Vitamins) سے بھرپور تازہ و خوشگوار و مزیدار اور صحت بخش ہونا مراد ہوگا قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر غذاؤں کی مختلف اقسام کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

دوسرا سوال کہ کتنا کھایا جائے؟ کے بارے میں فرمایا: و کلوا واشربوا

ولا تسرفوا انه لا یحب المسرفین (۳۱) کھاؤ پیو لیکن (کھانے پینے میں) اسراف نہ کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ دوسری آیت میں فرمایا: " ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین " (۳۲) حدود سے تجاوز نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ تیسرے حکم میں فرمایا: " ولا تبذر تبذیراً ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین " (۳۳) بے اعتدالی نہ کرو کیونکہ بے اعتدال لوگ شیطان کے بھائی ہوتے ہیں۔ کتنا کھانے کے بارے میں " اسراف، اعتداء اور تبذیر " یعنی پرخوری، زائد از ضرورت کھانے سے پرہیز کرنا قرآنی اصول ہیں۔ ان کی خلاف ورزی اللہ کی محبت اور اس کی رضا سے محرومی کا سبب ہوگی۔

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں حضور صلی اللہ علیہ و سلم نے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اقدامات فرمائے۔

بہت کھانے والے پیٹو سے اللہ کی پناہ مانگو: استعیذوا باللہ من الرغب۔ بھوک سے زیادہ کھانے والے کو اللہ پسند نہیں کرتا: ان اللہ یبغض الاکل فوق شبعہ، کھانا اتنا کھایا جائے کہ ایک دو نوالوں کی بھوک رہ جائے (۳۴)

معدے میں ایک حصہ کھانے، ایک حصہ پانی اور ایک حصہ سانس کے لئے چھوڑنا چاھئے (۳۵) معدہ بدن کا حوض ہے اور رگیں اس کی نالیاں ھیں اگر معدہ صحیح ہو تو رگیں درست رھتی ھیں، معدہ فاسد ہو جائے تو رگیں بھی بیمار ہو جاتی ھیں (۳۶) کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے اور مومن ایک آنت میں (۳۷)

حضور صلی اللہ علیہ و سلم کی ان ھدایات و ارشادات سے معلوم ہوا کہ

آپ کے نزدیک صحت و بیماری کا انحصار معدے پر ہے اور معدے کی صحت و بیماری کا انحصار بقدر ضرورت اور زائد از ضرورت کھانے پر ہے۔ طب قدیم و جدید کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تشخیص طب کے تمام طریقوں کا نچوڑ ہے بلکہ آپ نے دینی نقطہ نظر سے معدے کو بیماری و تندرستی کی بنیاد قرار دے کر تاریخ طب عالم میں ایک زبردست انقلاب کی بنا ڈالی۔ آپ ؐ نے یہ فرما کر کہ "کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے اور مومن ایک آنت میں"۔ بقدر ضرورت کھانے کو جزوایمان قرار دیا اور زائد از ضرورت کھانے کو کفر سے تعبیر فرمایا۔

چونکہ ہوا ، روشنی ، حرارت ، پانی اور غذا کو حیات و صحت کی بقا میں بنیادی حیثیت حاصل ہے ، اس لئے ان کی بقدر ضرورت دستیابی اسلام میں ہر مسلمان کا بنیادی حق ہے۔ مسلمان معاشرہ بالعموم اور مسلمان حکومت بالخصوص اس بات کی ذمےدار ہے کہ وہ اللہ و رسول ؐ کی طرف سے عائد ہونے والے اس دینی فریضے کی انجام دہی کے لئے جدید ترین سہولتیں اور ایجادات سے فائدہ اٹھا کر ان بنیادی ضروریات صحت کی فراہمی کا معقول بندوبست کرے۔ ان میں مضر صحت اجزاء کا انسداد کرے۔ صحت افزا اور حیات بخش عناصر کے بہم پہنچانے کا اہتمام کرے۔ صحت کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر سے بحث کرتے ہوئے یہ بات خاص طور پر توجہ طلب ہے کہ قرآن و سنت میں مذکور طبی ہدایات و فرامین محض اخلاقی تعلیمات نہیں کہ جس کا جی چاہے ان پر عمل کرے ، بلکہ یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن پر ایمان کا انحصار ہے۔ ان میں انفرادی یا اجتماعی طور پر کوتاہی کا مطلب ایمان میں کوتاہی ہے۔ اسی وجہ سے ہر دور کی اسلامی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملکی و معاشرتی حالات کے تحت قرآن کے ان بنیادی اصولوں کی بنیاد پر قوانین وضع کرے اور امت مسلمہ

کو ان پر چلائے ۔ قرآن و سنت کی یہ تعلیمات بظاہر اخلاقی معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے ۔ اگر ہم عہد رسالت کو سامنے رکھ کر ان تعلیمات کا مطالعہ کریں ، تو معلوم ہوگا کہ ان کی حیثیت فرامین و قوانین کی تھی اور حضور اکرم صلعم کی زبان مبارک سے نکلنے والا ہر لفظ ، حکم و قانون سمجھا جاتا تھا اور اس پر عمل کرنا فرد اور معاشرے کی ضمیر کے اطمینان کا باعث ہوتا تھا ، اور اس کی خلاف ورزی اسلامی ملک کے قانون کی مخالفت تصور کی جاتی تھی ۔ آج ان طبی اصولوں پر عمل کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد پر ملک میں قوانین بنائے جائیں جن کے پیچھے اخلاق و قانونی قوت موجود ہو ، ابلاغ علم کے ذریعے ان کی خوب تشہیر کی جائے اور ان کی خلاف‌ورزی کو قابل گرفت جرم قرار دیا جائے ۔

مندرجہ بالا بحث سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوئے :

۱ ۔ ہوا ، پانی ، غذا ، روشنی اور حرارت ہر مسلمان کا بنیادی حق ہے اور ان کی بقدر ضرورت فراہمی حکومت کا فریضہ ہے ۔

۲ ۔ ضروریات صحت کا صاف ، تازہ ، پاکیزہ اور صحت بخش ہونا ضروری ہے ۔

۳ ۔ مذکورہ بالا ضروریات زندگی کو صاف ، پاکیزہ اور تازہ رکھنے کے اعلیٰ انتظامات میں بدلتے ہوئے حالات کے تحت جدید ترین سہولتوں کا استعمال لازمی ہے ۔

اب ہم ان اقدامات کا جائزہ لیتے ہیں جنہیں اسلام نے صحت و توانائی میں مسلسل اضافے کے لئے لازمی قرار دیا ہے ۔ صاف ستھری ہوا ، تازہ شفاف پانی اور صحت بخش غذا کی دستیابی کے بعد صحت و توانائی میں اضافے کے لئے ضروری

ہے کہ انسانی بدن کے تمام اعضاء کو مضر صحت اثرات سے محفوظ کر کے انہیں نشو و نما کا صحیح موقع دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اسلام نے ایک جامع پروگرام مرتب کیا جسے طہارت کہا جاتا ہے۔ طہارت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے، کہ اس کے تقاضوں کو پورا کئے بغیر نہ تو کتاب ہدایت، قرآن حکیم کو ہی چھوا جا سکتا ہے ''لا یمسہ الا المطہرون'' (۳۸) اور نہ ہی اسلام کے رکن اعظم، نماز کی ادائیگی ہو سکتی ہے۔ ''لا تقبل صلوۃ بغیر طہور'' اس سے بھی بڑھ کر اسلام نے نظام صحت، طہارت، کو نصف ایمان قرار دیا ہے '' الطہور شطر الایمان''۔ طہارت کی اس اہمیت کے پیش نظر کتب احادیث و فقہ میں طہارت کو ہر چیز پر اولیت حاصل ہے۔

اسلام کی یہ تعلیمات کہ اللہ ہر وقت انسان کے ساتھ ہے اور اللہ پاک رہنے والوں سے محبت کرتا ہے نیز نماز مومنین کی معراج ہے، جس کے ذریعہ وہ اللہ سے ہمکلام ہوتے ہیں مسلمانوں کو ہر وقت پاک صاف اور معطر، ماحول میں رہنے کی تلقین کرتی ہے، لیکن اس بارے میں تعلیمات الٰہی کم از کم لوازم طہارت کا پابند بنا کر بہت سی چیزیں پاکباز و طہارت پسند مومنین کے اپنے ذوق پر چھوڑ دیتی ہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے صحابہ کرام رض کو طہارت کے متعلق ضروری تفصیلات سے بھی آگاہ فرمایا تھا۔

نماز کے لئے اللہ تعالیٰ نے وضو فرض کیا، جس کی بعض تفصیلات رسول اللہ ص نے متعین کیں، اس طرح وضو میں چہرہ، ناک، کان، منہ، حلق کی صفائی سے بدن کے وہ نازک اعضاء صاف ہو جاتے ہیں جن پر صحت کا دار و مدار ہے، دانتوں کی صفائی کے لئے مسواک (ٹوتھ برش) کے استعمال کی احادیث میں بڑی تاکید ملتی ہے، پھر ہاتھ پاؤں دھونے کے ساتھ انگلیوں کی درمیانی جگہوں کی صفائی پر بھی زور دیا گیا ہے۔

جنابت ، احتلام اور حیض و نفاس وغیرہ سے فراغت کے مواقع پر غسل فرض قرار دیا گیا ، علاوہ ازیں ہفتہ میں کم از کم جمعہ کے روز ایک دفعہ نہانے کی رسول اللہ ص نے تاکید فرمائی ، جس پر صحابہ کرام رض شدت سے پابند تھے ، ایک دفعہ جمعہ کے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر کھڑے بھرے مجمع سے خطاب کر رہے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کچھ تاخیر سے مسجد میں تشریف لائے اور بطور معذرت کہنے لگے کہ صرف وضو کر کے آگیا ہوں ، اس پر حضرت عمر رض نے فرمایا : تمہیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر غسل کر کے آنے کا حکم دیا کرتے تھے ؟ ،، (۳۹)

ناخن تراشنا ، زیر ناف اور بغل کے بال صاف کرنا ، نیز ختنہ وغیرہ کے ذریعہ صحت کی حفاظت کے بعض طریقوں کی نشاندھی کی گئی ۔

حیض کے متعلق رسول اللہ ص نے اپنے زمانہ میں مروجہ بہت سے غلط خیالات کی تردید فرمائی اور مختلف حالات میں عورتوں کو درپیش عوارض سے متعلق صحت و طہارت کے آداب سکھائے ، آپ ص نے اس قسم کی ہدایت کے لئے امہات المؤمنین کی تربیت بھی فرمائی ۔

رسول اللہ ص نے صحت کی حفاظت و بقاء کے لئے مذکورہ بالا ہدایات پر ہی اکتفاء نہ کی بلکہ اشیاء کے خواص معلوم کر کے ان کے ذریعہ مختلف امراض کے علاج کرنے کی ترغیب بھی دی ، آپ فرماتے تھے کہ اللہ نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں کی جس کی دوا موجود نہ ہو ،، اب یہ لوگوں کا کام ہے کہ وہ مختلف اشیاء کے خواص اور مختلف امراض کے اسباب و وجوہ معلوم کر کے ہر بیماری کے لئے اس کے مطابق دوا استعمال کریں ، ایک روایت میں آپ ص نے فرمایا : ,, فاذا وافق الدواء الاداء برئ باذن اللہ ،، یعنی جب دوا بیماری

کے حسب حال ہوتی ہے تو مریض اللہ کے قاعدہ کے مطابق صحت یاب ہو جاتا ہے۔ دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں: ”علمہ من علمہ و جہلہ من جہلہ“ (۴۰) یعنی اشیاء میں اللہ تعالیٰ نے جو خواص رکھے ہیں انہیں وہی لوگ جان سکتے ہیں جو انہیں جاننے کے لئے محنت کرتے اور علمی کاوشیں جاری رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ص کا یہ حکیمانہ جملہ ہمیں جدید طبی تحقیقات میں سرگرم رہنے کی پر زور دعوت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اطباء کی قدردانی فرماتے تھے تاکہ صحابہ رض میں علم طب سیکھنے کا جذبہ تقویت پائے آپ ص کے پاس عرب کے مختلف علاقوں سے ماہر اطباء آتے تو آپ خود ان کی خدمت سے فائدہ اٹھاتے اور اہل مدینہ کو ان کے تجربات سے مستفید ہونے کا موقع بخشتے ، ایک روایت کے مطابق عرب کا مشہور طبیب حارث بن کلدہ جو جندی شاپور کا تربیت یافتہ تھا مدینہ آیا (۴۲) اور بیرون ملک کے طبی علوم و تجارب سے اہل مدینہ کو متعارف کیا ، مسلم خواتین بھی طب کی تعلیم اور بیماروں کی دیکھ بھال نیز زخمیوں کی مرہم پٹی سے متعلق ممکن معلومات حاصل کرتی تھیں ، اس بارے میں حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما مثالی کردار ادا کرتی تھیں۔

آپ ص علم کے بغیر طب میں حصہ لینے کو پسند نہ کرتے تھے ، روایت ہے : ”من طبب و لم یعلم منہ الطب قبل ذلک فھو ضامن“ ۴۳ جو لوگوں میں علم سے واقف ہونے کی شہرت نہ رکھتا ہو اور علاج کرنے لگے تو مریض کو نقصان ہونے پر وہ تلافی کا ذمہ دار ہوگا۔ اس طرح رسول اللہ ص نے نیم حکیم عطائیوں کو لوگوں کی جانوں سے کھیلنے کی اجازت نہ دے کر ہمیں اطباء کی رجسٹریشن کی طرف رہنمائی فرمائی۔

رسول اللہ ص کی اسی قسم کی طبی ہدایات نے بعد میں مسلمانوں کو طبی

تحقیقات میں حصہ لینے پر رغبت دلائی ، چنانچہ مسلمانوں نے تاریخ میں قدیم علم طب پر جو اضافے کئے یا مختلف امراض کے معالجہ میں جو تخصصات حاصل کئے یا بیماروں کی دیکھ بھال کے لئے جو شفاخانے تعمیر کئے وہ رسول اللہ ص کی ہدایات کی روشنی میں کئے گئے ۔ رسول اللہ ص کی تعلیمات آج بھی مسلمانوں کو بالعموم اور مسلم حکومتوں کو بالخصوص طبی تحقیقات اور مریضوں کی دیکھ بھال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی دعوت دے رہی ہیں ۔

آج ہمارے سامنے ایک طرف مسلمان آبادی کا کثیر حصہ بیماری و نا توانائی میں بری طرح مبتلا ہے اور دوسری طرف اسلام کے اعلیٰ و ارفع مقاصد ہیں جو اپنی تکمیل کے لئے عملی تنفیذ چاہتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایک بیمار و ناتوان معاشرہ مقاصد اسلام تک پہنچنے کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا ۔ بیمار افراد یا جماعتیں شاید ان ادیان میں تو کوئی بلند مرتبہ حاصل کر سکیں، جو رہبانیت تجرد اور جوگی پن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، لیکن اسلام میں جن اعمال و افعال کو فوز و فلاح کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے ان کی رو سے انسانوں کا صحت مند، تندرست و توانا ہونا لازمی ہے ۔ مقاصد اسلام کو رو بعمل لانا کمزور، بیمار اور ناتوان انسانوں کے بس کا روگ نہیں ۔ اسلام کے نزدیک وہ شخص جو اجتماعی فرائض کی ادائیگی اور جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے معرکہ خیر و شر کا ایک کمزور سپاہی ہے ۔ حضور صلعم نے فرمایا ۔ ان المسلم الذی یخالط الناس و یصبر علی اذاھم افضل من الذی لا یخالط الناس ولا یصبر علی اذاھم ،، (۴۴) وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہو ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا ہو ۔ اس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا ۔

ہم نے اوپر مختلف مقامات پر اسلام میں صحت کی حفاظت کے دینی

فریضہ ہونے پر کافی بحث کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اس نعمت کا تحفظ ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ یہ بات اسلام کے مزاج میں داخل ہے کہ جب تک امت مسلمہ کے افراد اسلامی تعلیمات پر خود بخود عمل کرتے رہیں حکومت و ریاست کی طرف سے ان پر کوئی جبر نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اسلام میں مرغوب و مطلوب بھی یہی ہے کہ انسانوں کو قانون سے ھانکنے کے بجائے، اسلامی تعلیمات کی اخلاقی قوت سے حرکت میں لایا جائے۔ ہر فرد خود بخود اپنے فرائض کی انجام دھی میں مصروف ہو اور حکومت ایک نگران کی حیثیت سے امت کی رہنمائی کرتی رہے۔ عہد رسالت میں کلی طور پر اور عہد خلافت راشدہ میں بڑی حد تک اس پر عمل رہا، لیکن یہ اصول بھی اسلام ھی کا ہے، کہ جب افراد کی ایمانی قوت میں ضعف آجائے اور جہالت و ناداری انہیں اپنے فرائض سے غافل کر دے، تو ایسی صورت میں یہ فریضہ مسلمان حکومت اور معاشرہ کو ادا کرنا پڑتا ہے کہ وہ افراد ملت کو مقاصد اسلام سے آگاہ کر کے انہیں اس تک پہنچنے کے قابل بنائیں۔

اسلام کے ان بنیادی اصولوں کی روشنی میں ہم جب ایک طرف اپنے موجودہ حالات کو دیکھتے ہیں اور دوسری طرف مقاصد اسلام کی بلندیوں کو تو یقیناً موجودہ حالات میں افراد ملت کے لئے مقاصد اسلام کو پورا کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی اکثریت بیکاری۔ معاشی غلامی، جہالت اور بیماری جیسے مہلک امراض میں مبتلا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں افراد لاچار ہیں اور صورت حال کی پوری ذمہ داری مسلمان حکومت و معاشرے پر ڈالی جا سکتی ہے۔ عوام کے حالات میں تبدیلی کے دو طریقے ہیں ایک تدریجی اور دوسرا انقلابی۔ پہلے طریقے پر عمل کرکے تبدیلی لانے کا مطلب یہ ہے کہ ملک کے تمام حساس اور ترقی پسند عناصر ملک گیر پیمانے پر تبدیلی لانے کا پروگرام مرتب کریں۔

اور پورے ملک کے تمام مسائل کو سامنے رکھ کر ہمارے ترتیب دیئے ہوئے طریق کار کے مطابق بیکاری ۔ معاشی غلامی ، جہالت اور بیماری کے انسداد کا جامع منصوبہ بنائیں ۔ اور معاشرت و معیشت میں انقلابی تبدیلیوں کے ذریعے ان تمام خرابیوں کا فوری قلع قمع کر دیں ۔ انقلابی طریقہ اپنانے کا مطلب یہ ہے کہ بذریعہ انقلاب موجودہ تمام اداروں کو زیر و زبر کر دیا جائے اور پھر ان کے کھنڈرات پر نئے معاشرے کی تعمیر اس طرح کی جائے کہ افراد ملت کی مذکورہ بالا بیماریوں کا فوری مداوا ہو سکے ۔ ان دونوں میں سے کوئی طریقہ بھی نہ اپنانے اور حالات کو اپنی ڈگر پر چھوڑ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ حکومت اور معاشرے کو امت مسلمہ کے سواد اعظم سے کوئی دلچسپی نہیں ۔ جس کا دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ انہیں اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں ۔

مسلمانوں کو بیمار رکھنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام کا عقیدہ توحید اور اصول مساوات ضائع ہو جائیں ۔ مسلمانوں کا عالم انسانیت کے نگران اعلیٰ (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس) اور '' امۃ وسطا '' کی حیثیت سے خاتمہ ہو جائے ۔ اور امت مسلمہ '' شھداء علی الناس '' کے معزز مقام سے گر جائے ۔ اور عالمی رسالت کی تبلیغ و حفاظت کرنے والا دنیا میں کوئی نہ ہو اور دین اسلام کو ادیان عالم پر غالب کرنے کے عقیدے کی کھلم کھلا توہین و تضحیک ہو ، ان مقاصد اسلام کو ضائع کرنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ ان کے علمبرداروں کو بیماری و ناداری کی حالت میں چھوڑ دیا جائے اب اگر کسی مسلمان حکومت یا مسلمان معاشرے کو یہ گوارا نہیں کہ مقاصد اسلام ضائع ہوں تو اس کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی صحت کو باقی تمام مسائل پر ترجیح دے تاکہ مقاصد اسلام کے یہ علمبردار صحت و توانائی کے عالم میں ان کا پورا پورا تحفظ کریں اور ان پر عمل پیرا ہو کر نہ صرف پوری دنیا کے

مسلمانوں کے لئے خوشحالی و ترقی کے پیامبر بنیں بلکہ عالمی امن کو بحال کریں ۔ اور غیر مسلم دنیا پر امن و سلامتی قائم کریں ۔ اور اگر کوئی حکومت یا معاشرہ مسلمانوں کو بیماری و ناداری کی حالت میں چھوڑے رکھتا ھے، تو اس کا صاف مطلب یہ ھے کہ وہ مقاصد اسلام کو ضائع کرنا چاھتا ھے۔ اب ھمیں شعوری طور پر اس بات کا فیصلہ کرنا ھے کہ ھمیں مقاصد اسلام عزیز ھیں یا نہیں ؟ اگر عزیز ھیں ، تو اس کا واحد حل یہ ھے کہ اس کے ماننے والوں کی صحت کی بحالی کا فوری اهتمام کیا جائے ۔ اور اگر مقاصد اسلام عزیز نہیں ھیں تو منافقت کی روش چھوڑ کر کھلم کھلا ان کی مخالفت پر اتر آنا چاھئے تاکہ اس کے ماننے والوں کو پتہ چل سکے کہ ان کے دشمن کون ھیں ؟

مسلمانوں کی کثیر آبادی کو بیماری سے نجات دلانے کا فوری اور موثر طریقہ یہ ھے کہ طب کے میدان میں مقلدانہ روش چھوڑ کر مجتہدانہ طریق کار اپنایا جائے ۔ ھمارے موجودہ وسائل مغربی طریق علاج کے متحمل نہیں ھو سکتے۔ اس طریق علاج پر اگر پورے ملک کے پورے وسائل صرف کر دیئے جائیں تب بھی طبی ضروریات کو پورا کرنا محال ھے۔ اس لئے اجتہاد سے کام لے کر ھمارے اطباء کو چاھئے کہ وہ مقامی جڑی بوٹیوں کا پوری طرح احاطہ کریں ان کی خصوصیات کا مطالعہ کریں ۔ اور جدید معلومات و تجربات کی روشنی میں وسیع پیمانے پر ان سے ادویہ تیار کریں ۔ حکومت مقلدانہ پالیسی چھوڑ کر خود اقدام کرے اور ماھر اطباء کی سرپرستی کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرے۔ ان کے علوم و تجربات سے فائدہ اٹھائے ۔ پورے ملک کی طبی ضروریات کے تقاضے کے پیش نظر تربیت یافتہ اطباء کی فراھمی کا بندوبست کرے۔ مختلف مقامات پر تربیت گاھیں قائم کر کے اطباء کی تربیت کا اهتمام کرے۔

طبی نقطہ نگاہ سے موجودہ صورت حال میں دیہات کو سر فہرست رکھا

جائے۔ ہوا، پانی، غذا وغیرہ کی فراہمی قرآنی اصولوں کے مطابق ہر مسلمان کا حق تسلیم کیا جائے۔ ان کی صفائی، ستھرائی، پاکیزگی اور صحت بخشی کی ضمانت دی جائے (۴۵)

غیر ملکی ادویہ سے اسی حد تک استفادہ کیا جائے جس حد تک وہ ہماری مقامی بیماریوں اور ضروریات سے مطابقت رکھتی ھیں۔ دور اول کے مسلمان اطباء نے روم، یونان، کلدان، فارس اور ھند کی طب سے اس طرح استفادہ کیا تھا کہ انہیں مقامی حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ آج ہمارے اطباء کی ذہانت، لیاقت اور بصیرت کا امتحان ھے کہ وہ اپنے اجتہاد سے ہمارے لئے کیا اخذ کرتے ھیں۔ اس وقت طب مغرب کی تقلید کی ذمہ داری در اصل ہمارے اطباء پر عائد ھوتی ھے۔ اگر وہ اجتہاد و استنباط سے کام لے کر مغربی ایجادات و تجربات اور علوم کو مسلسل اپنے نظام طب میں سموتے جاتے تو آج ہماری طب انتہائی ترقی یافتہ ھوتی۔ موجودہ طبی بحران کا حل یہی ھے کہ ہمارے اطباء اپنی ذمہ داری سنبھالیں اور آگے بڑھکر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اسلامی نظام طب کو نئے سرے سے ترتیب دیں۔ اور جدید مغربی علوم و تجربات سے استفادہ کرتے ھوئے اسلامی نظام طب کی انفرادیت کو برقرار رکھیں۔

" زکواۃ " کی رقوم سے کام لیتے ھوئے حکومت اسلامی کا یہ فریضہ ھوگا کہ وہ اس طبی تحقیقی سرگرمی میں پورا پورا حصہ لے اور امت مسلمہ کی صحت کا اہتمام کرنے کی غرض سے جو مساعی ملک میں جاری ھیں ان کی نگرانی اور حوصلہ افزائی کرے، " فریضۃ من اللہ " کا یہی منشا ھے۔

حوالجات و حواشی

(۱) علم طب پر اکثر کتابوں میں یہ جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے طور پر استعمال ہوا ہے ، جو صحیح نہیں ہے ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ حضرت امام شافعی رح کا قول ہے - ابو الحسن علی بن عبدالکریم بن طرخان بن تقی الحموی علاءالدین الکحال (۶۵۰ - ۷۲۰ ھ) نے اپنی تصنیف (الاحکام النبویۃ فی الصناعۃ الطبیۃ ، طبع فی مصر ۱۳۲۴ - ۱۹۰۵ جلد اول ص ۱۲۵) میں اس پر بحث کی ہے - امام حموی نے الربیع بن سلیمان سے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے : العلم علمان علم الدین و علم الدنیا فالعلم الذی للدین الفقہ والعلم الذی هو للدنیا هو الطب (علم دو ہیں علم دین اور علم دنیا - علم دین تو علم فقہ ہے اور دنیا کے لئے جو علم ہے وہ علم طب ہے) دوسری روایت میں ہے - صنفان لا غنی للناس عنهما الاطبا لا'بدانهم والعلماء لا'دیانهم وما زال العلماء یعرفون الطب ویستعملونه (علماء کے دو طبقے انسانوں کے لئے ناگزیر ہیں - اطباء علم صحت بدن کے لئے ، اور علماء علم دین کے لئے - علماء ازل سے طب کی معرفت حاصل کرتے رہے ہیں - اور اسے استعمال میں لاتے رہے ہیں) یہ جملہ "العلم علمان ، علم الادیان و علم الا بدان" سند و روایت کے اعتبار سے خواہ کسی کا ہو ، اسلامی تعلیمات میں صحت کی اہمیت کا صحیح معنوں میں ترجمان ہے - (۲۲)

(۲) ابو الحسن علی بن عبدالکریم بن طرخان بن تقی الحموی علاءالدین الکحال ؛ الاحکام النبویۃ فی الصناعۃ الطبیۃ طبع فی مصر ۱۳۲۴ -- ۱۹۰۵ ، جلد اول ص ۱۲۵

(۳) ایضاً

(۴) صحیح مسلم ، کتاب الطہارۃ

(۵) قرآن - ۸ : ۳۹

(۶) قرآن - ۸ : ۶۰

(۷) نزول قرآن کے وقت "ومن رباط الخیل" سے مراد ہمیشہ تیار رہنے والے گھوڑے تھے - لیکن دور جدید میں ان سے مراد ہمیشہ تیار رہنے والی بندوقیں ، توپیں ، ٹینک ، اڑاکا طیارے ، میزائیل ایٹم بم ، آبدوز کشتیاں اور دوسرے خودکار ہتھیار ہیں - اور زمانہ جیسے جیسے ترقی کرتا جائے گا اور جو نئے نئے ہتھیار اور سازوسامان جنگ ایجاد ہوتا جائے گا - "ومن رباط الخیل" ان سب پر محیط ہوگا اس ضمن جو چیز صحت و طب کے نقطہ نظر سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ ان تمام ہتھیاروں کو بنانے اور ان کو ترقی یافتہ شکل میں رکھنے کے لئے صحت مند دماغ اور تندرست جسم کی اشد ضرورت ہے اور دوسرے ان تمام ہتھیاروں کے استعمال کے لئے انتہائی صحت مند و توانا افراد کی ضرورت ہے جو جہاد و قتال کے میدان میں ان سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکیں بیمار اور کمزور افراد ، ان کے متحمل نہیں ہو سکتے -

(۸) قرآن ، ۹ : ۲۴

(۹) قرآن ، ۹ : ۷۳

(۱۰) قرآن ، ۳۴ : ۱۵

(۱۱) قرآن ، ۳۴ : ۱۵

(۱۲) قرآن ، ۱۶ : ۱۱۲

(۱۳) تجرید بخاری حصہ اول کتاب التیمم حدیث نمبر ۲۰۳

(۱۴) قرآن ، ۱۰ : ۲۲

(۱۵) مشکوۃ المصابیح - حصہ اول حدیث نمبر ۳۰۴

(۱۶) صحیح بخاری ، کتاب الصلوٰۃ ، حدیث نمبر ۳۹۵ تا ۴۰۵

(۱۷) مشکوۃ ، کتاب المساجد

(۱۸) تجرید بخاری حصہ دوم ، کتاب الادب ، حدیث نمبر ۸۲۱

(۲۰) مشکوۃ ، جلد دوم ، حدیث نمبر ۴۹۴۳

(۲۱) سنن نسائی ، کتاب المساجد

(۲۲) قرآن ، ۷ : ۳۰

(۲۳) قرآن ، ۷ : ۳۱

(۲۴) صحیح بخاری ، کتاب الوضو ، حدیث نمبر ۱۳۶

(۲۵) تجرید بخاری ، حصہ اول حدیث نمبر ۴۵۱

(۲۶) ایضاً کتاب الوضو

(۲۷) ایضاً

(۲۸) تجرید بخاری حصہ دوم ، بدء الخلق

(۲۹) قرآن ۵ : ۴

(۳۰) قرآن ۵ : ۸۸

(۳۱) قرآن ۷ : ۳۱

(۳۲) قرآن ۵ : ۸۷

(۳۳) قرآن ۱۷ : ۲۶ - ۲۷

(۳۴) صحیح بخاری ، کتاب الاطعمۃ

(۳۵) سنن ترمذی ، ابواب الاشربۃ

(۳۶) مشکوۃ ، جلد دوم ، حدیث نمبر ۴۲۹۳

(۳۷) ایضاً حدیث نمبر ۳۹۲۵

(۳۸) قرآن ۵۶ : ۷۹

(۳۹) المستدرک للحاکم ، کتاب الطب

(۴۰) ایضاً ، امام خموی نے تو صراحت سے عجمی اطباء کا حضور ص کے پاس آنا ثابت کیا ہے (الاحکام النبویۃ فی الصناعۃ الطبیۃ ، جلد دوم ، ص ۳)

(۴۱) طبقات الاطباء ، لابن ابی اصیبعہ ۔ امام حموی کی روایت کے مطابق حضور ص کے پاس اطباء العرب کے علاوہ اطباء العجم بھی آیا کرتے تھے : وکان یقدم علیہ اطباء العرب و العجم (الاحکام النبویۃ فی الصناعۃ الطبیۃ ، جلد دوم ، ص ۳)

(۴۲) المستدرک للحاکم ، کتاب الطب

(۴۳) امام حموی ، الاحکام النبویۃ فی الصناعۃ الطبیۃ ، ص ۱۰

(۴۴) بیہقی ، شعب الایمان و جامع ترمذی کتاب ، الزھد

(۴۵) مسلمانوں کے سواداعظم کی آبادی ، اس وقت دیہات میں ہے ، بدقسمتی سے دیہات میں جس قدر مسلمان آبادی کی کثرت ہے ، اسی قدر بیماری کی بھرمار ہے ۔ اس سلسلے میں سب سے قابل افسوس یہ بات ہے کہ موجودہ طبی نظام دیہات کی مدد کے بجائے اس کے خلاف عمل پیرا ہے ۔ قبل از تقسیم ہند ، ہندو سنیاسی اور مسلمان حکیم اکثر دیہاتی طبی ضروریات کو پورا کیا کرتے تھے ۔ ہندو بھارت چلے گئے اور مسلمان اطباء شہروں میں منتقل ہو گئے ۔ دیہات پوری طرح بیماری کی گرفت میں آ گیا ۔ حکومت نے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز کے نام پر شہروں میں دیہاتیوں کے لئے ہسپتال قائم کر رکھے ہیں ، لیکن عملاً وہ صرف شہریوں کے لئے وقف ہو کر رہ گئے ہیں ۔ درج ذیل واقعہ اس تکلیف دہ صورت حال کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے ۔

یکم ستمبر کو ضلع گوجرنوالہ کے ایک گاؤں بوپڑہ کلاں میں ایک دوہرے قتل کا واقعہ پیش آیا ، نوجوان بیوی موقع پر ہلاک ہوگئی ۔ بیس بائیس سالہ جوان خاوند کی گردن قاتلوں سے پوری طرح کٹ نہ سکی، اسلئے ابھی ہوش و حواس کے ساتھ زندہ تھا ۔ گوجرنوالہ ڈسڑکٹ ہیڈ کوارٹرز سول ہسپتال کے انچارج سے فوری طور پر تحریری درخواست کی گئی کہ ایک انسانی جان بچانے کے لئے ایمبولینس بھیجی جائے ۔ سول میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے تحریری جواب دیا کہ ہم ایمبولینس کو دیہات میں جانے کی اجازت نہیں دے سکتے ۔ نتیجۃً نوجوان خاوند بروقت طبی سہولت نہ پانے کی وجہ سے ہلاک ہوگیا ۔

نظامِ زکوٰۃ

اور جدید

معاشی مسائل

محمد یوسف گورایہ

ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد